تشریحی لسانیات

ڈاکٹر سہیل بخاری

تشریحی لسانیات

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو سندھ
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری

نام کتاب	:	تشریحی لسانیات
مصنف	:	ڈاکٹر سہیل بخاری
طبع اول	:	١٩٩٨ء
قیمت	:	١٠٥ روپے
ناشر	:	جعفر رضا، اے-١٠٠، سیکٹر ١٥-بی، نارتھ کراچی
طابع	:	فضلی سنز، اردو بازار کراچی
تقسیم کار	:	فضلی بک سپر مارکیٹ ٣-١١ پاری بلڈنگ سہیل روڈ، اردو بازار، کراچی فون: ٥ - ٢٦٢٩٧٢٠ فیکس: ٢٦٣٣٨٨٧

میں یہ ناچیز تحفہ

برادر عزیز عبدالرحمن قریشی

پرنسپل
ایچی سن کالج لاہور
و
سابق پرنسپل
پاکستان ایئر فورس کالج سرگودھا

کی نذر کرتا ہوں

جن کی طویل رفاقت سے میں نے خلوص کا صحیح مفہوم سیکھا

فہرست

عرضِ مصنف

زبان کی ایجاد انسانی فطرت کا تقاضا اور انسانیت کا شرف ہے۔ اس کا مقصد بیانِ کائنات، اس کی بنیاد انسانی گویائی اور اس کی وسعت انسانی سوچ کی پرواز ہے۔

زبان تاریخی ادوار میں نہیں مکانی علاقوں میں منقسم ہے۔ اس کی زمانیت ایک وہم اور مکانیت ایک اتفاق ہے۔ اس کی ولادت ایک واقعہ اور وفات ایک المیہ ہے۔ اس کا تغیر ایک التباس اور بوقلمونی ایک حقیقت ہے۔

زبان اب پیدا نہیں ہوتی وہ عہدِ تاریخ سے قبل پیدا ہو چکی ہے اور ہمیشہ کے لئے پیدا ہو چکی ہے۔ عہدِ تاریخ آج تک ایک زبان بھی پیدا نہیں کر سکا، پال نہیں سکا، سنوار نہیں سکا۔

زبان نہ انسان ہے، نہ درخت، نہ دریا۔ یہ سب استعارے، تشبیہیں اور مجاز کی باتیں ہیں۔ زبان نہ بچے پیدا کرتی ہے، نہ شاخیں نکالتی ہے، نہ دھاروں میں بٹتی ہے۔ اس کی راہ ایک سیدھی لکیر ہے جس پر وہ استقامت سے قدم قدم چلی آ رہی ہے اور آگے بھی چلتی رہے گی۔

زبان نہ قدیم ہوتی ہے نہ جدید، صرف زبان ہوتی ہے۔ سیاسی انقلابات کے باعث ملک کی کوئی سی ایک علاقائی زبان سرکاری یا قومی زبان بن جاتی ہے لیکن دوسری اصلیہ زبانوں کی طرح اپنے علاقے میں اس وقت بھی علاقائی زبان کی طرح بولی جاتی ہے۔ لوگ غلطی سے اسے جدید اور اس کی کسی دوسری اصلیہ زبان کو قدیم سمجھتے ہیں۔

زبان بدلتی بھی نہیں ہے۔ آج تک کوئی زبان نہیں بدلی۔ تاریخِ انسانیت کسی ایک زبان کے بھی بدلنے کے مدارج نہیں دکھاتی اور عہدِ تاریخ سے قبل کی بے دلیل باتیں کرنا افسانہ طرازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لوگوں نے زبان کی بوقلمونی کو جو اس کی مکانی خصوصیت ہے زمانی تبدیلی و تغیر کا نام دے دیا ہے۔

تاریخِ لسانیات میں سب سے بڑی بات یہ کہی گئی ہے کہ زبان مر جاتی ہے جبکہ کوئی زبان آج تک نہیں مری ہے۔ جب تک کسی زبان کے بولنے والوں میں سے دو شخص بھی زندہ ہیں ایک کہنے والا دوسرا سننے والا وہ زبان مر نہیں سکتی اور دنیا کی ہر زبان کے بولنے والوں کی تعداد قدیم سے آج تک دو سے زیادہ ہی رہی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ محققین جس زبان کی لپی نہیں سمجھ پاتے ہیں یا غلط سمجھے ہیں اسے مردہ سمجھ بیٹھے ہیں کیونکہ وہ اس کا بے ڈھنگا اور بے تکا سا تلفظ کرنے لگے ہیں۔

زبان کی دو طبعی خصوصیات ہیں۔ ایک روایت پرستی دوسری تخلیق۔ وہ نہ صرف اپنے موجود سرمائے کی سختی سے حفاظت کرتی ہے اور اپنے بولنے والوں کو غلط روی سے روکتی اور غلط گوئی پر ٹوکتی ہے بلکہ مسلسل نئے نئے لفظ ڈھال ڈھال کر اس سرمائے میں اضافہ بھی کرتی رہتی ہے۔

بظاہر صوتی تبادل وہ نمایاں اساس ہے جس پر تبدیلیِ زبان کا مفروضہ قائم کیا گیا ہے لیکن یہ زبان کے مزاج کا ترکیبی اصول ہے اور دنیا کی ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں حقیقت ہے۔ اس کا سبب زبان کے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی مفروضہ وجہ نہ آب و ہوا ہے نہ زمین کی بناوٹ، نہ انسانی گلے کی ساخت ہے نہ بیماروں کی کمزوری، نہ بچوں کی ناسمجھی ہے نہ بوڑھوں کا سہو، نہ بے پڑھوں کی لغزش ہے نہ سیانوں کی جدت۔ یہ سب مغرب کے ماہرینِ لسانیات کی ذہنی اختراعات اور خام خیالیاں ہیں۔

صوتی تبادل خراشِ زبان کے مختلف وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے۔ اس کا براہِ راست تعلق معنی آفرینی سے ہے۔ مشرق اور مغرب والوں کی موشگافیوں کے باوجود اقسامِ معنی کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ کائنات جتنی وسیع اور جہانِ معنی جس قدر فراخ ہے اس کا اندازہ اور نظارہ کرنے کے لئے صوتی تبادل کی اصول سازی پر واقفینِ زبان کے سامنے عقیدت سے سر جھک جاتا ہے اور تحقیق کرنے والے کو اپنے بے بضاعتی، کم مائگی اور ناتوانی کا شدید احساس ہونے لگتا ہے۔

زبان لفظ سے شروع ہوتی اور لفظ پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ لفظ میں انسانی زندگی کا تجربہ، احساس و فکر کی تصویر، صحبت کا لطف، معنی کی گہرائی اور جادو کا زور ہے اور لفظ ہی اور مصدر، اسم اور جملہ سب کچھ ہے۔

زبان ایجادِ انسانی کی معراج اور عجائباتِ عالم کا سرمایۂ افتخار ہے۔ جس طرح عالمِ طبیعی میں آگ، کشش ثقل، بھاپ اور بجلی و شمسی توانائی وغیرہ عہد ساز دریافتیں ہیں اسی طرح زبان کی

دنیا میں آوازوں کی ساخت، ان کی شرحیں اور آخروں میں تقسیم اور صوتی تبادل وغیرہ انسان کی محیرالعقول ایجادات ہیں۔

ہر زبان کا ایک مخصوص جغرافیائی علاقہ، ایک الگ سماج اور ایک جداگانہ کلچر ہوتا ہے۔ زمین کو سب سے پہلے خدا نے اس کی ساخت کے لحاظ سے تقسیم کیا بعد میں انسان نے لسانی بنیادوں پر اسے بانٹا۔ زمین کی یہ دونوں تقسیمیں پہلی اور بنیادی تھیں۔ ایک خدائی دوسری انسانی۔

زبان اسلاف کی ایجاد ہے اور اخلاف کے لئے اعجاز کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اسلاف تو دنیا کی تقریباً تین ہزار زبانیں بنا گئے اور ہم سے اب تک ایک زبان بھی نہیں بن سکی بلکہ ہم اس زبان کی پوری حقیقت بھی ابھی تک دریافت نہیں کر پائے ہیں جو وہ بنا کر چھوڑ گئے ہیں اور جو کچھ اس سلسلے میں منکشف بھی ہو پایا ہے اس کے بارے میں آخری بات نہیں کہی جا سکتی۔

اردو بھی دنیا کی ہزاروں زبانوں میں سے ایک زبان ہے اور انھیں کی طرح قدیم ہے اور اس میں بھی وہی تمام لسانی خصوصیات ملتی ہیں جو کسی دوسری زبان میں پائی جاتی ہے۔ اس کے متعلق ہمارے یہاں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ ہمارے غیر لسانی زاویہ نگاہ نے پھیلائی ہیں۔ خود مغرب میں بھی مختلف لسانی مشکلات غیر لسانی نقطہ نظر سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ لسانی مسائل صرف لسانی اصولوں سے حل ہوتے ہیں اور ادبی یا غیر لسانی اصولوں سے الجھ جاتے ہیں اس لئے مشرق کے ماہرین لسانیات ہوں یا مغرب کے انھیں لسانی اصول سامنے رکھ کر ہی لسانی مسائل پر غور کرنا چاہئے۔

جس طرح کھیل کا لطف کھیل کے دوران میں ہی حاصل ہوتا ہے اور وہی اس کا حاصل ہوتا ہے اسی طرح تحقیق کا حاصل بھی وہ لطف ہوتا ہے جو تحقیق کے دوران میں ہی ملتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ تحقیق کا نہ قرار واقعی کوئی صلہ مل سکتا ہے نہ کسی کو ملتا ہے۔ کسی مادی یا مادی لالچ یا خوف کی بنیاد پر کوئی تحقیق نہیں ہو سکتی صرف تحقیق کا فریب دیا جا سکتا ہے۔ تحقیق کا پروگرام فرمائشی نہیں ہو سکتا۔

میں نے آنے والے صفحات میں بہت سی باتیں دوسروں سے ہٹ کر کہی ہیں۔ ان کی صحت کا فیصلہ اہل علم و دانش پر ہے۔ تحقیق میں کوئی بات آخری نہیں ہوتی۔ اس میں کسی منزل کا نہیں رہگذر کا بیان ہوتا ہے۔ کچھ کھونے پانے کی خواہش یا خوف نہیں کچھ کر گزرنے کی دھن رہتی ہے البتہ اپنی تحقیق سے مجھے اتنا اطمینان قلب ضرور حاصل ہے کہ میں نے اپنے علم اور یقین کی حد تک جو کچھ اور جیسے کچھ پایا، محسوس کیا اور سمجھا ہے وہ پوری پوری دیانت داری سے کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔

میں صحیح قدم اٹھانے پر نازاں نہیں اور غلط قدم پڑنے پر شرمسار نہیں کیونکہ دونوں صورتیں سفر سے مشروط ہیں اور سفر میرے باطن کا تقاضا ہے۔

لسانیات کے موضوع پر میری کتاب "اردو کا روپ" ۱۹۷۱ء میں چھپی تھی۔ "اردو کی کہانی" ۱۹۸۰ء میں نکلی۔ اس کے بعد "اردو کا اشتقاقی لغت" انجمن ترقی اردو پاکستان کے سہ ماہی رسالے "اردو" میں قسط وار چھپ کر مکمل ہوا۔ جب سے اب تک میرے سوچ کا سفر برابر جاری رہا۔ بہت سی نئی نئی باتیں میرے سامنے آئیں، نئے نئے انکشافات ہوئے۔ میں نے اپنے ذہنی و تحقیقی سفر کے ان تمام واقعات و تجربات کو کتابی شکل میں پیش کر دینا ضروری سمجھا۔ یہی اس کتاب کی وجہ تصنیف ہے۔

موجودہ کتاب میں میری پچھلی کتابوں سے کچھ باتیں زیادہ ہیں کچھ کم ہیں اور بعض مقامات پر ان کے صرف حوالے درج کر دئے ہیں۔ غرض اس موضوع پر میری یہ مختلف کتابیں میرے سوچ کی راہ کے مختلف نشانات ہیں چنانچہ اس بات کا سراغ لگانے کے لئے کہ اس سفر میں میرا سوچ کن کن اونچی نیچی راہوں پر چلا ہے اور کن کن اوگھٹ گھاٹیوں سے گزرا ہے ان کتابوں کا تاریخ وار مطالعہ کرنا ضروری ہے لیکن کسی نکتے کے متعلق میرا آخری خیال وہی سمجھا جانا چاہئے جو پیش نظر کتاب میں دیا گیا ہے۔

سہیل بخاری
یکم فروری ۱۹۸۲ء
اے-۲۶۵، بلاک جے شمالی ناظم آباد۔ کراچی

پہلا باب

زبان کیا ہے

ا۔ زبان کی تعریف:

زبان مقررہ صوتی علامات کا ایک ایسا مواصلاتی نظام ہے جس کی مدد سے کسی سماج کے افراد آپس میں مل جل کر کام کرتے ہیں۔ علامت اس شے کو کہتے ہیں جو کسی دوسری شے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ زبان کے معاملے میں اس علامت کی ظاہری صورت انسانی کلام کا ایک جزو ہے اور یہ جس شے کی نمائندگی کرتی ہے یا جس کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی اس کی باطنی سطح اس جزو کلام کے معنی ہیں۔ مقررہ علامت سے مراد وہ علامت ہے جس کی صورت اور معنی میں کوئی فطری یا قدرتی رشتہ نہیں ہوتا اور مقررہ صوتی علامت منہ سے ادا ہونے والی چند آوازوں کا وہ مجموعہ ہے جسے ہم لفظ کہتے ہیں اور جس کے معنی انسان نے اسی وقت مقرر بھی کر دئے تھے جس وقت آوازیں ملا کر لفظ بنایا تھا مثلاً "پیڑ" جسے فارسی میں درخت، عربی میں شجر، سنسکرت میں ورکش، بنگالی میں روکھ اور انگریزی میں ٹری (Tree) کہتے ہیں۔ اردو میں صرف اس لئے پیڑ کہلاتا ہے کہ اردو بولنے والے اسے اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ معنی اسے اسی وقت دے گئے تھے جس وقت یہ گھڑا گیا تھا۔ "معنویات" کے عنوان کے تحت میں اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

دنیا میں زبان کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسانی سماج کا۔ اس کے وجود اور عمل کے لئے کم از کم دو انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بولنے والا (متکلم) اور دوسرا سننے والا (سامع)۔ چنانچہ جب سے یہ دونوں انسان وجود میں آئے زبان بھی پیدا ہو گئی اور جب تک یہ دونوں موجود رہیں گے زبان بھی نہیں مر سکتی یعنی زبان کا وجود انسانی سماج کا محتاج ہے۔ دوسری طرف انسانی سماج کو بھی اپنی تنظیم کے لئے زبان کی ضرورت ہے کیونکہ زبان کے بغیر سماج کے افراد اتنا قریبی اور گہرا باہمی تعلق قائم نہیں رکھ سکتے کہ ان سے سماج مرتب ہو سکے۔ سماج کی تشکیل کے لئے افراد کے مل جل کر رہنے کی خواہش درکار ہوتی

ہے اور یہ خواہش مشترک زبان سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔

زبان کو مقررہ صوتی علامات کا مواصلاتی نظام اس لئے کہا گیا ہے کہ کلام کے تمام اجزا بامعنی، مربوط اور مرتب ہوتے ہیں۔ الفاظ سب کے سب اپنے معنی دیتے ہیں اور آپس میں مربوط ہوتے ہیں بلکہ اپنے کل معنی جملے سے بھی الگ الگ ربط رکھتے ہیں اور ایک خاص ترتیب سے ادا ہوتے ہیں۔ ان کی ترتیب، ربط باہمی اور معنویت میں انسانی عقل اور شعور اپنا پورا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چنانچہ نہ بے معنی الفاظ کا ڈھیر زبان کہلا سکتا ہے، نہ نامربوط اجزا سے انسانی کلام عبارت ہو سکتا ہے اور نہ غیر مرتب فقروں کو کسی نظام کا نام دیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے زبان آوازوں کے ملنے سے بنتی ہے اور آواز وہ احساس ہے جو کان کے پردے سے ہوا کی لہروں کے ٹکرانے پر پیدا ہوتا ہے۔ عناصر فطرت جب باہم ٹکراتے ہیں تو ان کے ٹکراؤ سے ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں جو کان کے پردے کو جھنجھنا دیتی ہیں مثلاً کسی چٹان پر گرتا ہوا آبشار کا پانی، پہاڑوں سے ٹکرانے والی ہوا، جنگلوں کو جلا کر خاکستر کر دینے والی بھڑکتی آگ اور باہم ٹکرا کر گرجنے والے بادل مخصوص قسم کی بے معنی، بے مقصد اور غیر شعوری آوازیں پیدا کرتے ہیں جنھیں ہم شور کہہ سکتے ہیں۔

اسی طرح جانداروں کے پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا جب ان کے منہ اور گلے کے حصوں سے رگڑتی ہے تو آواز پیدا کرتی ہے لیکن یہ ایک شعوری عمل ہے جس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد اور ارادہ ضرور ہوتا ہے۔ جانوروں کی چیخیں اسی زمرے میں آتی ہیں اور اسی ذیل میں انسانی چیخوں کا بھی شمار ہو سکتا ہے جو شدت جذبات میں منہ سے نکل جاتی ہیں جیسے آہ، اوہ، اوئی، اسے، ہے، اودو، آہو، ہو ہو، آہا، ہا، اوں ہوں، ہوں، ہیں، ایں وغیرہ۔ یہ آوازیں یا چیخیں عناصر قدرت کے تصادم سے پیدا ہونے والی آوازوں سے اس لئے مختلف ہوتی ہیں کہ ان میں چیخنے والے کی شعوری کوشش اور مقصد و منشا کو بھی دخل ہوتا ہے اور شور میں یہ خصوصیات نہیں ملتیں۔

آوازوں سے ہی انسان کی زبان بنتی ہے لیکن چیخوں میں اور انسانی زبان میں بہت کچھ فرق ہے۔ آج دنیا میں ہزاروں زبانیں بولی جا رہی ہیں یعنی انسانی نسل ہزاروں زبانیں استعمال کر رہی ہے پھر ان میں سے بھی ہر ایک کے مختلف مقامی محاورے بولے جا رہے ہیں اور ہر فرد کی زبان میں بھی مختلف رنگ ملتے ہیں۔ یوں انسانی بول چال رنگ رنگی نظر آتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ کسی خاص موقعے پر انسان کیا کہے گا اور کس قسم کی زبان بولے گا یعنی اس کے منہ سے کیسی آوازیں نکلیں گی۔ لیکن

ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ بلی اپنے مالک سے ناز کرنے میں کیسی آواز نکالے گی۔ کتا چور پر کس آواز سے بھونکے گا۔ اجنبی آدمی کو دیکھ کر الّو کیسے بولے گا۔ دانہ دیکھ کر مرغی اپنے بچوں کو کیسے بلائے گی اور گلہری کو دیکھ کر کیسے کڑکڑائے گی۔ مراد یہ ہے کہ چیخ کی آوازوں میں اتنے رنگ نہیں ہیں جتنے زبان کی آوازوں میں ہیں۔ اس لئے ہم جانوروں کی چیخوں کی تو پیشین گوئی کر سکتے ہیں لیکن انسانوں کی گفتگو کے بارے میں پہلے سے کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔

جانوروں کی چیخوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ نہ صرف گوریا (گھریلو چڑیا) کی پوری نسل ایک ہی طرح چہچہاتی ہے بلکہ ہر گوریا ہر بار ایک ہی سی آواز نکالتی ہے۔ شیر کی نسل ایک ہی طرح دہاڑتی ہے اور ہر شیر ہر بار اسی طرح چنگھاڑتا ہے جیسے وہ پہلے چیخا تھا۔ جانوروں کی ہر نسل اپنی اپنی مخصوص آوازوں سے پہچانی جاتی ہے۔ جانور کہیں پیدا ہوا ہو اور کہیں پلا بڑھا ہو وہی آواز نکالے گا جو اس کی نسل سے مخصوص ہے۔ گھر میں پلے ہوئے کتے بلی کی چیخ بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کسی جنگلی کتے بلی کی۔ ہر کتا بھوں بھوں کرے گا۔ ہر چڑیا چوں چوں بولے گی۔ ہر بکری میں میں کرے گی۔ ہر بلی میاؤں میاؤں پکارے گی۔ ہر مینڈک ٹرّائے گا۔ ہر مرغا ککڑوں کوں بولے گا۔ ہر کوا کائیں کائیں کرے گا۔ ہر سانپ پھک پھک کی آواز نکالے گا۔ غرض یہ ہے کہ ہر جانور کی نسل کی ایک مخصوص چیخ ہوتی ہے اور جو نسل کی چیخ ہوتی ہے وہی چیخ وہ خود بھی نکالتا ہے اور اسی طرح نکالتا ہے۔ نہ اس کی نسل کے دوسرے فرد کی چیخ اس کی چیخ سے مختلف ہوتی ہے نہ خود اس کی دو چیخوں میں کبھی کوئی فرق آتا ہے لیکن دو انسانوں کی زبان ایک سی نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی انسان کی دو موقعوں کی گفتگو بھی الگ الگ ہوتی ہے۔

جانوروں کی چیخ کی اس یکسانیت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نقل کا نتیجہ نہیں ہو سکتی یعنی دیکھ یا سن کر نہیں سیکھی جا سکتی لیکن زبان دوسرے کو دیکھ دیکھ کر اور سن سن کر سیکھی جاتی ہے۔ نقل میں سو فیصدی صحت قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ایک انسان جب دوسرے انسان سے اور بچہ بڑے سے زبان سیکھتا ہے تو اس کی نقل کرتا ہے اور نقل میں اس سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ چیخ فطری آواز ہے جو قدرت کی جانب سے نسل کے ہر فرد کو عطا ہوتی ہے۔ اسی لئے اس میں خطا کا امکان نہیں ہوتا اور زبان انسان خود بناتا ہے جس میں غلطی ممکن ہے۔

جانوروں کی حرکات کے مشاہدوں اور تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ وہ فوراً ایک دوسرے کی نقل نہیں کرتے۔ بندر بہت بڑا نقال مشہور ہے۔ وہ بھی انسان ہی کی طرح نقل کر کر کے بہت کچھ سیکھتا ہے لیکن وہ صرف حرکات کی نقل کرتا ہے۔ زبان یا آوازوں کی نقل نہیں کر پاتا۔ ہاں توتا، مینا ضرور

انسانی بولی کی نقل کرتے ہیں لیکن وہ بھی صرف اتنے ہی الفاظ بول پاتے ہیں جتنے انھیں سکھا دیے جاتے ہیں اور اتنی ہی باتیں کہہ سکتے ہیں جتنی انھیں بتا دی جاتی ہیں۔ اس باب میں وہ کمپیوٹر سے مشابہ ہیں کہ ان میں جتنا بھر دیا جائے گا اتنا ہی نکلے گا۔ نہ نیا قاعدہ ایجاد کرنے کی کمپیوٹر میں ہی سکت ہے اور نہ نیا لفظ گھڑنے کی ان نقال جانوروں میں ہی صلاحیت ہے۔

ہر جانور کی چیخ کی مقدار محدود ہے۔ وہ ایک حد کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ وہ نہ اسے مختصر کر سکتا ہے نہ طویل۔ لیکن انسان کے کلام کا سلسلہ موقع محل کے لحاظ سے کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ اسے گھٹا بڑھا بھی سکتا ہے۔ پھر ہر جانور زیادہ سے زیادہ صرف چند چیخیں ہی نکال سکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ انھیں کو بار بار دہرا لیتا ہے۔ زبان کی آوازوں کی طرح چیخوں کا ذخیرہ اتنا کثیر اور وسیع نہیں ہوتا کہ وہ بدلتے ہوئے موقعوں پر نئی آوازیں نکال سکے۔ جانور نے جو چیخ پہلے نکالی تھی وہی آگے بھی نکالے گا لیکن انسان ایسے کلمے بھی بول سکتا ہے اور بول لیتا ہے جو نہ اس سے پہلے اس نے کبھی بولے تھے اور نہ سنے تھے یعنی چیخ کے امکانات محدود اور زبان کے امکانات لامحدود ہوتے ہیں۔

جانوروں کی چیخ بہت سادہ سی ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی اور آواز سے بن سکتی ہے اور نہ اس سے مزید کوئی اور چیخ بن سکتی ہے۔ اس کی آواز میں کوئی گہرائی یا الجھاؤ نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں زبان ایک بہت ہی پیچیدہ نظام ہے جس میں بھانت بھانت کی آوازیں استعمال ہوتی ہیں۔ ان کے باہمی تعلق میں پیچ و خم ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بھی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ زبان کے ڈھانچے کی ترکیب میں ایک تناسب اور معنی کی باریکی اور نزاکت میں ایک فنی مہارت پوشیدہ ہوتی ہے۔

چیخ بھاری اور باریک، نرم اور سخت، کھردری اور سریلی، نیچی اور اونچی، خوش آیند اور ناگوار ہوتی ہے۔ انسان کے منہ سے جو آوازیں اظہار جذبات کے لئے نکلتی ہیں یہ خصوصیات ان میں بھی پائی جاتی ہیں اس لئے دونوں کو ایک ہی خانے میں رکھا جا سکتا ہے لیکن انسانی زبان میں ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تجزیہ ہو سکتا، اس کو معنی دار لفظوں اور لفظوں کو آوازوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جانوروں کی چیخ کا اس طرح تجزیہ نہیں ہو سکتا کیونکہ چیخ کا ڈھانچا اک ڈال ہوتا ہے اور زبان کا ڈھانچہ جزواً جزواً جوڑ کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا تجزیہ ممکن بھی ہے اور آسان بھی اور یہ بھی چیخ اور زبان کا ایک بہت بڑا فرق ہے۔

موسیقی کے راگوں کی طرح جانوروں کی چیخ بھی آواز کی صرف ایک ہی قسم یعنی سر (صوت علت) سے بنتی ہے۔ اس کا اُسر (صوت گنگ) سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن انسان نے اپنی زبان میں استعمال

کرنے کے لئے آوازوں کو دو بڑی بڑی قسموں سُر (صوت علت) اور سُر (صوت صحیح) میں تقسیم کر لیا ہے۔ ان دونوں قسموں کو ملا ملا کر ہی اس نے اپنی زبان کے اجزا (الفاظ) تیار کئے ہیں۔ اب اگر وہ جانوروں کی آوازوں کو بھی اپنی زبان سے ادا کرنے میں اسروں (صوت صحیح) کا استعمال کر لیتا ہے تو گویا اپنی زبان کی دیکھا دیکھی ہی ایسا کرتا ہے جس کی اسے عادت پڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ چڑیوں کی "چوں چوں" کی چہ کے لئے کتے کی بھوں بھوں، بلی کی میاؤں، بکری کی میں میں، بلی کی میاؤں وغیرہ صرف اس کے تخیل کی پیداوار اور اپنی زبان کی نقل ہے جیسے وہ چیخ کے سر (صوت علت) کی جگہ شامل کر لیتا ہے۔

زبان کا انسانی سانس سے گہرا تعلق ہے۔ واضعین زبان نے تشکیل زبان کے وقت یہ حقیقت پیش نظر رکھی ہے بلکہ اسے بطور خاص مرکز توجہ بنایا ہے کہ زبان سے کلام کی ادائگی کے وقت سانس پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ چونکہ انسانی سانس کا طول مقرر ہوتا ہے اس لئے کلام انسانی کو بھی اس طول سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسے سانس کے معمولی اور معیاری طول سے قدرے کم ہی رہنا چاہئے کیونکہ بولتے وقت سانس پر دباؤ پڑنے سے اس کی لمبائی گھٹ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صاف اور با وضاحت ادائگی کے لئے بھی مقدار کلام کا طول نفس سے کم ہونا ضروری ہے۔ اگر جملہ سانس ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ ہی ختم ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا آخری حصہ، گر نہ صاف، مشکوک اور مبہم تاثیر رہ جائے گا اور یہ صورت حال کسی طرح بھی افادیت کلام کے حق میں نہیں جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ زبان میں جملے یعنی مجموعہ الفاظ کے طول کی معیاری حد ہوتی ہے اور یہ حد سانس کے طول کی مناسبت سے مقرر ہوتی ہے۔

پھر جس طرح ہم یکبارہ پوری سانس خارج کر دیتے ہیں یہ ضروری نہیں ہے کہ جملہ بھی اول سے آخر تک اسی یکساں رفتار سے ادا کر کے فارغ ہو جائیں کیونکہ جملے میں کچھ تو ہمارے مقاصد کے پیش نظر آواز کے اتار چڑھاؤ، زور و تاکید اور وقفہ و تسلسل کی ضرورت پڑتی ہے اور کچھ مخاطب کے سمجھنے کی آسانی کے خیال سے بھی ان وسائل سے کام لینا ہوتا ہے چنانچہ ہم مفرد جملے کو بھی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بولتے ہیں اور یہ ٹکڑے ہماری سانس کی مناسبت سے ہی کئے جاتے ہیں۔ یہ ٹکڑے کبھی کبھی صرف ایک لفظ سے اور اکثر ایک سے زیادہ الفاظ کے مجموعے سے بنتے ہیں۔

حقیقی کلام میں فقرے کی گونج کا تعلق تو اپنی موسیقیت کے باعث کانوں سے ہے لیکن سجع کے باعث کلام میں جو توازن پیدا ہو جاتا ہے اس کا براہ راست تعلق متکلم کی سانس سے ہوتا ہے جس سے ادائگی میں سہولت آ جاتی ہے اور اس کا خوشگوار اثر سامع پر بھی پڑتا ہے۔ مرکب جملوں کا طول و اختصار اور الفاظ کے متناسب مجموعوں میں مفرد جملوں کی تقسیم کے اس وقت سانس لینے کی سہولت ہی کا قرا

ہوتی ہے۔ مرکبات ناقص یا غیر مفید کا شمار الفاظ کے انھیں متناسب مجموعوں میں ہوتا ہے۔

سانس کا خیال الفاظ کی ساخت میں بھی رکھا جاتا ہے۔ زبان میں لفظ کا ناپ معین ہوتا ہے جو کم از کم ایک رکن کے برابر ہوتا ہے۔ اردو میں لفظ کی زیادہ سے زیادہ مقدار تین ارکان کے برابر ہوتی ہے اور جب یہ مقدار تین ارکان سے بڑھ جاتی ہے یعنی جب لفظ میں تین سے زیادہ ارکان جمع ہو جاتے ہیں تو لفظ کو مختصر کر کے اس کا وزن تین رکن کے برابر لے آتے ہیں۔[1] اس اصول میں بھی سانس کی سہولت ہی مدنظر رکھی گئی ہے۔

غرض یہ ہے کہ زبان کا سانس سے بہت گہرا تعلق ہے کیونکہ زبان آوازوں سے بنی ہے اور آوازوں کا مدار سانس کی آمد و رفت، طول و اختصار، اتار چڑھاؤ اور تیزی اور آہستگی پر ہے۔ زبان کے مطالعے میں ہمیں اس تعلق سے برابر سابقہ پڑتا ہے۔

۲۔ زبان کی خصوصیات:

زبان کی تعریف کے ساتھ ساتھ اگر یہاں اس کی کچھ اہم خصوصیات بھی بیان کر دی جائیں تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اس سے اس کی فطرت کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

۱۔ زبان کے وسیلے سے ہم ماضی، حال اور مستقبل کا حوالہ دے سکتے ہیں اور قریب کی چیزوں یا باتوں کے ساتھ ساتھ دور کی چیزوں یا باتوں کی طرف بھی اشارہ کر سکتے ہیں۔ کوئی اور انسانی یا غیر انسانی مواصلاتی نظام ایسا نہیں کر سکتا۔

۲۔ جہاں تک مواصلاتی وسیلے کا تعلق ہے انسانی زبان میں حیوانات کے نظام اشارات کے برعکس یہ اعلیٰ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنا وسیلہ تبدیل کر دیتی ہے۔ آواز اور حرف یعنی تقریر اور تحریر ایک دوسرے سے بدل جاتی ہے۔

۳۔ زبان کے کچھ مخصوص ضابطے ہوتے ہیں اور وہ ان کی پابندی کرتی ہے۔ لیکن ان ضابطوں میں دم گھونٹ دینے والی جکڑ بندی بھی نہیں ہے۔ اس کی جگہ اس میں بہت کچھ لچک اور کشادگی ملتی ہے البتہ اس ڈھیل کی حد مقرر ہے یعنی نہ اس میں بالکل کھلی چھٹی، من مانی آزادی اور انتشار ہے اور نہ مطلق نفس اور جبریت و استبداد کی عملداری ہے۔ اس کی فضا دو کناروں کے درمیان کا ایک مراقبی وسیلہ

---

[1] یہ ہماری بول چال کا قاعدہ ہے۔ اس کی وضاحت "مشتقات" کے باب میں آگے دیکھئے۔

لیکن محدود سا میدان ہے جس کے اندر رہ کر نقل و حرکت کی کافی گنجائش ہے مگر اس کی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مثلاً زبان میں کئی آوازیں ملا ملا کر لفظ بنانے کا عام قاعدہ موجود ہے جس کی رو سے اردو میں بھی بیری، بیا، بیلا اور جو گھر کے الفاظ بنائے گئے ہیں لیکن انھیں آوازوں کو ملا کر ریڑی، ملیڑھا اور موبکو جیسے الفاظ بنانے کی اجازت نہ پہلے ہی تھی نہ اب مل سکتی ہے۔ لفظ "بھیں" کے معنی مکمل ہوتی کی بجائے کی، ضرب، اور ملاؤ وغیرہ تو ہیں لیکن کلڑی، بکلا، ربس اور ترانہ نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔

۳۔ اسی طرح زبان کا ایک گرامری یا نحوی ڈھانچا بھی ہوتا ہے یعنی کلام انسانی ان واضح اصولوں کے مطابق ہوتا ہے جو اس کی صحت کے لئے مقرر کر دیے گئے ہیں البتہ یہ ڈھانچا لچکیلا ہوتا ہے یعنی بہت سے لفظوں کو برابر رکھ کر جملہ بنانے کا قاعدہ ملتا ہے لیکن اس کے ساتھ اجزا کی ترتیب فاعل + مفعول + فعل۔ جیسے (عرفان رضا دودھ پیتا ہے) بھی ہو سکتی ہے۔ فاعل + فعل + مفعول (جیسے Sattar lost his book) بھی ممکن ہے اور فعل + فاعل + مفعول (جیسے ضرب زید خالد) کی بھی اجازت ہے چنانچہ یہ کہنے کا اختیار ہے کہ "سورج پورب سے نکلتا ہے" اور یہ کہنے کی بھی آزادی ہے کہ "پورب سے سورج نکلتا ہے" لیکن "ہے پورب نکلتا سے سورج" قطعی ناقابل قبول ہے۔

زبان ماضی بعید کے اتنے گہرے اندھیرے میں پیدا ہوتی ہے کہ اب ہمارے لئے اس کی پیدائش کے وقت کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں ہے البتہ ایک بار پیدا ہو جانے کے بعد وہ انسانوں کی نوک زبان پر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس کا سلسلہ وقت کی طرح اٹوٹ اور عام انسانیت کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ تسلسل کا خاصہ اس کی بقا کا ضامن اور روایت اس کی صحت کی ضمانت ہے۔ تواتر اس کی تازگی اور تکرار اس کی دل نشینی کی اساس ہے۔ چنانچہ زبان کی ایک اور اہم خصوصیت اس کی روایت ہے اور روایت شکنی کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ زبان کے نظام میں ڈھیل، اس کے استعمال میں چھوٹ اور اس کے رویوں میں میل جول من مانی باتیں تو ہیں لیکن ان سب کو ہمیں آپ کی یعنی سماج کی رضامندی حاصل ہے۔ پھر اس میں کتنے دن نئے ایجاد و اختراع کے وسیلے سے نئے نئے روپ بنتے اور چالو ہوتے رہتے ہیں اس میں بھی سماج کا ایما شامل ہوتا ہے۔ زبان کا پورا سرمایہ اور اس کا مکمل نظام روایت کے سہارے ہی آگے بڑھتا ہے۔ سماج اس روایت کی سختی سے پابندی اور حفاظت کرتا ہے۔ زبان کے استعمال میں بولنے والوں کو جو آزادی ملی ہوتی ہے اس کی حدود مقرر ہیں۔ ان حدود سے گزر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے جو اصول مقرر ہیں انھیں توڑنے کا کسی کو حق یا اختیار نہیں ہے۔ اسی لئے سماج اس کے استعمال میں بہت

محتاط اور حساس ہوتا ہے۔ کوئی غلط تلفظ سے بولتا ہے، غلط لفظ پر زور دے دیتا ہے، لفظ کو بے محل صرف کر جاتا ہے، لفظوں کی ترتیب بگاڑ دیتا ہے تو سننے والے چونک اٹھتے ہیں۔ خاص طور سے غلط تلفظ تو برداشت ہی نہیں کر پاتے۔ ایک دم ہنس پڑتے ہیں، فوراً ٹوک دیتے ہیں، اصلاح کر دیتے ہیں اور پاس ادب مانع آتا ہے یا اخلاق آڑے آ جاتا ہے تو صرف زیر لب مسکرا کر رہ جاتے ہیں لیکن معاف کسی حال میں بھی نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنے آپ کو زبان کے ناموس کا محافظ سمجھتے ہیں۔ اینٹونسل کہتا ہے "ہم صحیح بولنا چاہتے ہیں اور ہمارے دوست ہمارے تلفظ، گرامر اور اسلوب کی غلطیاں برابر درست کرتے رہتے ہیں[1]"۔

۵۔ بیشتر علما (ماہرین لسانیات، ماہرین زبان اور فلاسفہ) تسلیم کرتے ہیں کہ زبان ہماری شناخت، منطقے اور رویوں کے سوچ کو بھی متاثر کرتی ہے[2]۔

۶۔ زبان میں دہرا پن ہوتا ہے یعنی آوازوں کو ملا کر ایک طرف تو لفظوں کی ظاہری صورت قائم کی جاتی ہے اور دوسری طرف اس صوتی ہیئت یعنی ملفوظی روپ کو معنی بھی دیے جاتے ہیں۔ مفرد آواز کے الگ سے کوئی معنی نہیں ہوتے اس لئے اسے زبان بھی نہیں کہتے۔ معنی آوازوں میں اس وقت داخل ہوتے ہیں جب وہ مل کر ایک لفظ بن جاتی ہیں اور یہی زبان کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ لفظ کا ایک طرف تو آواز سے تعلق ہوتا ہے اور دوسری طرف معنی سے لیکن یہ ہر علامتی نظام کی خصوصیت ہے کہ اس میں ہمیشہ دو پہلو ہوتے ہیں۔ ظاہر اور باطن۔ ہیئت اور مواد۔ صورت اور سیرت اور اس خصوصیت میں زبان بھی ان نظاموں کے ساتھ برابر کی شریک ہے لیکن زبان میں ایک اور دہرا پن بھی ہوتا ہے جو ڈھانچے کا دہرا پن کہلاتا ہے۔ اس میں نہ صرف آوازوں ہی سے لفظ بنتا ہے بلکہ لفظوں کو ملا کر جملہ بھی بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ لفظ ایک جانب آوازوں سے اور دوسری جانب جملوں سے مربوط اور وابستہ ہوتا ہے۔ جو لفظ آوازوں سے بنتا ہے وہ خود بھی جملے بناتا ہے۔ اس خصوصیت میں زبان دوسرے علامتی نظاموں سے ممتاز اور منفرد ہے۔

۷۔ دنیا میں جس وقت سے انسانیت کی تاریخ شروع ہوتی ہے زبان اپنی مکمل شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس کی پیدائش یعنی ایجاد کا حال کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ اس کی ابتدائی نشوونما اور افزائش و توسیع کا علم بھی نہیں ہے البتہ یہ معلوم ہے کہ جس گھڑی انسانیت عہد تاریخ میں داخل ہوتی ہے زبان حق مندی، تجلی کچھٹی تک سے درست اور انسانی زندگی کی تمام ضروریات پوری کرتی نظر آتی ہے اور اس حد تک پوری کرتی نظر آتی ہے کہ آج اس میں کہیں بھی کوئی نقص یا کمی نہیں پائی

۱۔ ایسپکٹس آف لنگویج ص ۲۰

۲۔ لنگویج اینڈ لنگوئسٹکس ص ۲۰

ایک وقت میں ایک آواز کا کبھی دو کا کبھی تین کا اور کبھی کبھی چار چار آوازوں کا تبادل بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً اوستا اور سنسکرت آپ فارسی آب، ویدک کرد فارسی خرد، ویدک کریم فارسی غرامیم (ہم چلیں)، ویدک پرشتھا فارسی فرشتہ، اردو ڈھانکنا اور ڈھانپنا، اردو تھال دکنی تھاڑ (او نچا درخت)، اردو کانٹا پنجابی کنڈا، اردو بھاگنا پنجابی وڈانا، اردو بہار چھپاؤ ابہار بھاڑ، چھوٹنا چلنا، بھینت بل بدھ، تھال تھوڑ وغیرہ۔

۱۲۔ زبان میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں جس کے باعث کبھی کبھی متکلم اور مخاطب میں غلط فہمی بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن انسان نے الفاظ میں کثرت معنی کی روایت اس لئے رکھی ہے کہ وہ اس کے ان گنت، مختلف النوع اور پہلو دار تخیلات کا ساتھ دے سکیں۔ زبان اظہار خیالات کا وسیلہ ہے جسے انسان نے اپنی عقل کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ نت نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جہاں اس نے کلمات زبان سے نئے نئے الفاظ کی اختراع کا اصول بنایا ہے وہاں اس خیال سے کہ روز افزوں الفاظ کا بوجھ ناقابل برداشت نہ ہو جائے، حسب ضرورت ہر لفظ کے فرائض میں اضافہ کرنے کا اصول بھی ساتھ ہی رکھ دیا ہے۔ چنانچہ جس طرح آوازوں کے تبادل کے باوجود معنی نہیں بدلتے اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر معنی بدل جاتے ہیں لیکن لفظ نہیں بدلتا۔

۱۳۔ زبان تبدیلات کا نظام ہے۔ اس میں ہر جزو کا بدل رکھا گیا ہے یا بدل تلاش کرنے کا اصول طے کر دیا گیا ہے۔ زبان کی یہ خصوصیت ہمیں اول سے آخر تک نظر آتی ہے۔ مثلاً

الف: جہاں تک آوازوں کا تعلق ہے ہر زبان نے اپنے اپنے لئے دنیا کی بہت سی آوازوں میں سے کچھ آوازیں منتخب کر لی ہیں اور پھر ہر زبان کی آوازیں بھی آپس میں ایک دوسرے سے بدل جاتی ہیں لیکن اس سے لفظوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ب: آوازوں سے بننے والے الفاظ بھی تبادل ہوتے ہیں یعنی ایک کی جگہ دوسرا الفاظ رکھا جا سکتا ہے۔ انھیں مترادفات کہتے ہیں جو کبھی ہم معنی اور کبھی قریب المعنی ہوتے ہیں جیسے نام اور اسم، کل اور اکل، چندا، ماہ اور چاند، جی اور من، روحی اور جی، بیت اور بیت، بیٹا، رنا اور بیٹا، کھانا اور نگلنا وغیرہ۔

ج: ایک ہی معنی کے لئے کبھی ایک لفظ، کبھی ایک فقرہ اور کبھی ایک جملہ بولا جاتا ہے جیسے "ہرا پان" اور "پان ہرا ہے" کے معنی ایک ہی ہیں حالانکہ ان میں سے ایک مرکب اور دوسرا مکمل جملہ ہے یا جیسے کھاؤ، "بہت کھانے والا" اور "بہت کھاتا ہوا" میں پہلا صرف ایک لفظ ہے اور باقی دو

مرکبات ہیں لیکن مفہوم تینوں کا ایک ہی ہے یعنی تینوں اجزا سے کلام باہم تبادل ہیں۔

د: جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے جملے میں الفاظ کی نحوی ترتیب بھی مختلف زبانوں میں مختلف ہوتی ہے۔ اور یوں زبانوں کے مابین ترتیبی تبادل کی مثالیں بالکل واضح ہیں لیکن خود ایک زبان میں بھی ہمیں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً

وہ ہاتھی جھومتا ہے۔

اور

وہ جھومتا ہاتھی ہے۔

یا

میں آپ کو کل پوری بات بتا دوں گا
آپ کو پوری بات میں کل بتا دوں گا
کل پوری بات میں آپ کو بتا دوں گا
پوری بات میں آپ کو کل بتا دوں گا

۴۔ وظائف زبان:

انسان نے اپنی فطرت کے تقاضے سے مجبور ہو کر زبان بنائی ہے۔ قدرت نے اسے قوت گویائی بخشی ہے اور اس کے منہ اور گلے کے اعضا اور عضلات میں بولنے کی صلاحیت اور اہلیت ودیعت فرمائی ہے۔ ان اعضا کی مدد سے انسان نے زبان کی ایجاد کی اور ایسا قابل فخر کارنامہ انجام دیا جس نے اسے حیوانات سے ممتاز کر کے اشرف المخلوقات کا اعزاز بخش دیا۔ بقول ولیم انڈونسل انسان بولتا حیوان ہے[1] اور ہربرٹ ریڈ کہتا ہے کہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق زبان سے زیادہ اہم نہیں ہے[2]۔ ہم مشرق والے بھی اپنی بول چال میں انسان کو حیوان ناطق کہتے ہیں۔ اب اس انسان نے یہ زبان جو ایک بار فطرت کے تقاضے کے مطابق ڈھال لی اس کے مختلف کام انجام دیتی ہے۔ اس سے کسی نہ کسی قسم کا استفادہ کیا جاتا ہے۔ یہ افراد کے کسی نہ کسی کام آتی ہے اور کوئی نہ کوئی وظیفہ ادا کرتی ہے۔ چنانچہ ایف آر پامر زبان کے وظائف کی درجہ بندی یوں کرتا ہے:

۱۔ دی سائنس آف لینگویج، ص
۲۔ فلاسفی اینڈ دی آرٹ آف لینگویج، ص

۱۔ اطلاع دہی: زبان سے ہم دوسروں کو خبریں پہنچاتے ہیں۔ اپنے وہ تجربات اور دنیا کے وہ حقائق فراہم کرتے ہیں جن کا انھیں علم نہیں ہوتا۔

۲۔ سوال اور حکم: اطلاعات فراہم کرنے کے علاوہ زبان سے ذریعے سے ہم سوال کر کے انجانی باتیں دریافت کرتے ہیں۔ کبھی ہم دوسروں کے سوال کا جواب دیتے ہیں اور جو حقائق وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں انھیں بتاتے ہیں۔ کبھی ہم کسی کو کسی کام کے کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہ قسمیں بیشتر زبانوں کی گرامروں کے استفہامیہ اور امریہ جیسے جملوں میں ملتی ہیں۔

۳۔ اثر اندازی: زبان سے دوسروں کو متاثر کر کے ان کے جذبات بھڑکانے، انھیں ڈرانے دھمکانے وغیرہ کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ بچہ سب سے پہلے زبان سے یہی کام لینا سیکھتا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے رونے سے دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ بھی جان جاتا ہے کہ مناسب زبان استعمال کر کے وہ دوسروں کو متاثر کر سکتا ہے کہ وہ لوگ اس کو غذا دیں اور اس کے ساتھ کھیلیں۔

۴۔ تبصرہ: ہم کچھ ایسی باتیں بھی کرتے ہیں جنھیں بیان حقائق نہیں بلکہ تبصرہ سمجھا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں ہم زبان کے اس استعمال سے دوسروں کے رویے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ خود "اچھا" اور "برا" کے الفاظ کسی حقیقت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ کسی شے کی قدر و قیمت بتاتے ہیں اور دوسروں کے بارے میں ہمارے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

۵۔ سماجی رابطے کی استواری: ان مقاصد کے علاوہ بعض اوقات زبان کے استعمال سے نہ بولنے والے کا فائدہ مد نظر ہوتا ہے نہ سننے والے کا یعنی زبان کا استعمال کسی خارجی مقصد کے بغیر بھی ہوتا ہے۔ اس وقت زبان دو انسانوں کے درمیان سماجی رابطہ قائم کرنے کا کام کرتی ہے جیسے موسم کے متعلق انگریزوں کی بات چیت یا تقریبات میں مختصر سی غیر اہم گفتگو اور چٹکلے۔ یہ سب باتیں نہ اطلاعات فراہم کرنے کے لئے ہوتی ہیں نہ دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے۔ بلکہ ایک دوسرے کے بیوی بچوں کی خیریت یا حالات دریافت کرنے کا مقصد بھی صحیح صحیح حقائق یا معلومات حاصل کرنا نہیں بلکہ آپس میں سماجی رابطہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ یہ انسان کے عام سماجی رویے کا ایک حصہ ہے۔[۱]

جیوفرے لیچ نے بھی ذرا سے اختلاف کے ساتھ زبان کے پانچ کام گنائے ہیں۔

۱۔ اطلاع دہی: واقعات اور حقائق کا بیان

۲۔ اظہار ذات: زبان بولنے اور لکھنے والے کے خیالات، جذبات اور رویے ظاہر کرتی ہے۔

۱۔ پامر۔ سیمانٹکس: ایک نیا خاکہ ص ۵۹

اس کی بہت کھلی ہوئی مثالیں عہد اور قسم کے الفاظ اور فجائیہ کلمات ہیں۔

۳۔ اثر اندازی: ہم زبان کے ذریعے سے دوسروں کے افعال اور رویوں کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کی مثالیں احکامات اور التجائیں یا درخواستیں ہیں۔ اس کام میں توجہ سننے پڑھنے والے پر ہوتی ہے اور اس کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے۔

۴۔ حسن آفرینی: زبان صرف اپنے فن کی خوبی ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس کے سوا اس کے استعمال کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ شعر و ادب اس کی مثالیں ہیں۔

۵۔ سماجی رابطے کی استواری: زبان ابلاغی راستوں کو کھلا اور سماجی تعلقات کو درست رکھنے کا وظیفہ بھی انجام دیتی ہے۔ برطانوی کلچر میں موسم کے متعلق گفتگو اس کی بہترین مثال ہے۔ زبان کے اس کام میں یہ غرض نہیں ہوتی کہ کوئی کیا کہتا ہے بلکہ صرف یہ مد نظر ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کہتا ہے۔

آگے چل کے جیوفرے لیچ کہتا ہے کہ زبان کے ان پانچوں کاموں کا تعلق پانچ لازمی باتوں سے ہے پہلے (اطلاع دہی) کا تعلق مواد اور موضوع سے، دوسرے (اظہار ذات) کا بولنے لکھنے والے سے، تیسرے (اثر اندازی) کا سننے پڑھنے والے سے، چوتھے (حسن آفرینی) کا پیغام سے اور پانچویں (سماجی رابطے کی استواری) کا تعلق ابلاغی راستے سے ہے۔[۱]

ایم اے کے ہیلی ڈے کے نزدیک زبان کا ڈھانچا اس کے وظائف سے قریبی تعلق رکھتا ہے اور یہ وظائف کلچر سے مخصوص ہیں۔ زبان کے استعمال کی مخصوص مثالوں میں وہ عام وظائف ملتے ہیں جو تمام کلچروں میں مشترک ہیں۔ ہم زبان کے استعمالات یا کاموں کی چاہے جتنی بڑی فہرست مرتب کر لیں جب تک اس کی بنیاد زبان کے ڈھانچے کے تجزیے پر نہیں رکھی جائے گی درست نہیں ہوگی۔ یعنی ہم کو زبان کے ایسے وظائف بیان کرنا چاہئیں جو کسی مخصوص نفسیاتی یا سماجی رجحان سے وابستہ ہونے کے بجائے زبان کا ڈھانچا سمجھنے میں معاون ہوں چنانچہ ہیلی ڈے زبان کے صرف تین وظائف بتاتا ہے:[۲]

۱۔ اظہاری: زبان بولنے والے کے مطابق یعنی حقیقی دنیا کے تجربے کا اظہار کرتی ہے جس میں اس کے شعور کی داخلی دنیا بھی شامل ہے۔ زبان کے اس وظیفے سے تجربے کا ایک ڈھانچا بنتا ہے اور معاملات کو سمجھنے کے لئے ایک نقطۂ نظر قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

۲۔ تعلقاتی: زبان سماجی تعلقات قائم کرتی ہے۔ یعنی دو شخصوں کے درمیان ان کے باہمی عمل اور رد عمل سے سماجی کردار ادا کرنے والی حیثیتیں پیدا کرتی ہے مثلاً سوال کرنے والا یا

۱۔ سیمانٹکس ص ۲۰۔۲۹

۲۔ لیو ہارڈ ون گلوٹکس ص ۲۳۔۲۲

جواب دینے والا، حکم دینے والا یا حکم بجا لانے والا، درخواست کرنے والا یا درخواست کو رد یا قبول کرنے والا۔ زبان کے اس وظیفے سے سماجی گروہ طے ہوتے ہیں اور فرد کی شناخت قرار پاتی ہے کیونکہ دوسروں سے اس کا رابطہ استوار کر کے زبان اس کی شخصیت کی نشوونما اور استحکام میں مدد دیتی ہے۔

۴۔ تالیفی: زبان خود اپنے اجزا میں بھی ربط دیتی ہے اور جس موقع پر اس کا استعمال ہوتا ہے اس سے اس میں بھی مطابقت پیدا کرنا پڑتی ہے۔ زبان متکلم یا مصنف کو حسب موقع مسلسل گفتگو یا عبارت تیار کرنے میں مدد دیتی ہے اور پڑھنے سننے والے کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اس مسلسل کلام اور دوسرے پراگندہ اور بے ربط جملوں کے درمیان امتیاز کر سکے۔

زبان کے وظائف کی مندرجہ بالا فہرستوں پر نظر ڈالنے تو معلوم ہو گا کہ وظائف کی تعداد میں بے ضرورت اضافہ کیا گیا ہے جب کہ بظاہر انھیں لوگوں کے بیان کے مطابق زبان کے صرف تین کام نظر آتے ہیں۔

۱۔ اطلاعاتی: جہاں تک حقائق اور اطلاعات کے دوسروں تک پہنچانے یا حاصل کرنے کا تعلق ہے یہ صرف ایک ہی کام گنا جا سکتا ہے۔ اسے ہم دو نہیں کر سکتے۔ کبھی ہم دوسروں سے سوال کر کے معلومات حاصل کرتے ہیں کبھی دوسروں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انھیں حقائق اور معلومات ہم پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ ہماری طرف سے از خود اطلاع دہی یا ہمارے سوال پر دوسروں کے جواب کے ذریعے سے ہماری اطلاع یابی ایک ہی قسم کا کام ہے جس میں ایک ہی چیز یعنی اطلاع یا حقائق کا لین دین ہوتا ہے۔ چنانچہ پامر بھی سوال کو اپنی بیان کی ہوئی دوسری قسم میں رکھنے کے بعد اسے اطلاع سے ہی متعلق قرار دیتا ہے۔[۱] اس کو ہم متکلم کی ذات کا اظہار بھی کہہ سکتے ہیں جیسے جیوفرے لیش نے اظہار ذات کے نام سے ایک الگ وظیفہ شمار کیا ہے حالانکہ بولنے لکھنے والے کا اپنے خیالات، جذبات اور رویے کا قسم، حمد اور فجائیہ کلمات وغیرہ کے ذریعے ظاہر کرنا اطلاع دہی کے ہی ذیل میں آتا ہے۔ یہی بیلی ڈنے کا اظہاری وظیفہ بھی ہے اور تعلقاتی وظیفے کا ایک جزو بھی اس میں شامل ہے جو سوال کرنے اور جواب دینے سے متعلق ہے۔ اس میں زبان بولنے والے کی داخلی اور خارجی دنیا کے حقائق اور تجربات کا اظہار کرتی ہے۔ پیغامات اور سندیسے بھیجنا یا وصول کرنا، کہانیاں کہنا کہلوانا، واقعات سننا سنانا اور سوال جواب کرنا یہ دوسرے کام اسی ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔

۲۔ اثر اندازی: یہ زبان کا دوسرا وظیفہ ہے۔ ہم دوسروں کے جذبات کو متاثر کر کے

۱۔ سیمانٹکس، ایک مطالعہ، ص ۹۵

ان سے کام لیتے ہیں۔ اپنی اور ان کی حیثیت اور درجے کے لحاظ سے زبان کو مختلف پیرایوں سے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کسی سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارا فلاں کام کر دے۔ کبھی کسی کو کام کا حکم دیتے ہیں۔ کبھی دوسرے کے آگے اپنی خواہش یا تمنا پیش کرتے ہیں تاکہ وہ ہم سے ہمدردی کرنے پر مائل ہو جائے۔ کبھی قسمیں کھاتے اور عہد کرتے ہیں تاکہ وہ ہم پر بھروسا کر کے بیچ جائے۔ کبھی ہم دوسروں سے ہمدردی جتاتے، ان کو خوش کرتے اور ان کو اپنے دکھ درد اور خوشی میں شریک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کاروباری اشتہار بازی، سیاسی پروپگنڈے اور مذہبی مواعظ میں زبان کا یہی مخصوص کام ہوتا ہے۔ پامر کی اوپر بیان کی ہوئی چوتھی قسم "تبصرہ" بھی اسی میں شامل ہے کیونکہ ہم اپنے تبصرے سے بھی دوسروں کو ہم خیال بنانے ہی کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ ہمارے کام آسکیں۔ اسی وظیفے میں بیلی ڈنے کے "تعلقاتی" وظیفے کا دوسرا جزو حکم دینا اور حکم بجا لانا یا درخواست کرنا یا درخواست کو قبول یا رد کرنا بھی شامل ہے۔ جیوفرے لیش کی چوتھی قسم "حسن آفرینی" بھی اسی کے تحت آجاتی ہے کیونکہ شعر و ادب کے نمونوں سے بھی ہم دوسروں کے جذبات ہی گرماتے ہیں۔

زبان کے وظائف کی مندرجہ بالا فہرستوں کی چند اقسام میں بیلی ڈنے کی پہلی قسم "اظہاری" میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دوسری قسم میں اس نے سائل اور مجیب جیسے دو کرداروں کے حوالے سے بات کہنے کا ایک نیا ڈھنگ نکالا ہے لیکن بات وہی ہے جو دوسروں نے کہی ہے البتہ تیسری قسم "تالیفی" بالکل نئی ہے لیکن اس بات پر زیادہ دھیان دینے کی وجہ سے کہ زبان کے ڈھانچے اور اس کے وظائف کا تعلق بنیادی اور گہرا ہے وہ زبان کا وظیفہ چھوڑ چھاڑ کر اس کے ڈھانچے ہی کی طرف ڈھل گیا اور یہ بھول گیا کہ زبان کا داخلی ربط یعنی مربوط جملے یا عبارت اور موقع محل سے اس کی مناسبت اور مطابقت دونوں چیزیں انسان کے فکری تسلسل کی عکاس ہیں جس کے زیر اثر زبان ڈھلی گئی ہے اور جس کا اظہار زبان کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم ان خصوصیت کو زبان کا ڈھانچا یا ڈھانچے کی خصوصیات تو کہہ سکتے ہیں، زبان کا وظیفہ نہیں کہہ سکتے اور ڈھانچے اور وظیفے میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے یعنی زبان کا ڈھانچا اس کا وظیفہ نہیں کہلا سکتا چاہے دونوں میں کتنا ہی گہرا تعلق کیوں نہ ہو۔

۳۔ سماجی تعلقات استوار کرنا: یہ زبان کا تیسرا وظیفہ ہے۔ پامر اور جیوفرے لیش کی فہرستوں میں اس کا نمبر پانچواں ہے اور سے جے بی رائلڈ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔[۱]

۱۔ یو جینوا ڈز ان لنگوسٹکس، ص ۹۰

جب دو آدمی کسی ایک جگہ مثلاً کسی پارک کے سنسان گوشے میں، ریل کے ڈبے میں یا اس میں ذرا سی دیر کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو بظاہر وقت گزاری کے لئے بات چیت کرنے لگتے ہیں۔ اس سے ان کو کوئی مادی منفعت مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف بات کرنے کی خاطر باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اس لئے بات کرتے ہیں کہ دوسرے انسان کو دیکھ کر چپ رہ نہیں سکتے۔ ان کی فطرت انھیں ایسا کرنے پر اکساتی بلکہ مجبور کرتی ہے اور جب وہ اپنی فطرت کے تقاضے کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں تو ایسے اجنبی انسان سے بھی گھل مل کر باتیں کرنے لگتے ہیں جس سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور جس سے صرف تھوڑی سی دیر کا ساتھ پڑا ہے۔ فرصت کے اوقات کی خوش گپیاں، بازار کے بھاؤ پر تبصرے، ذاتی اور شخصی سوالات اور ان کے جوابات، پڑوسیوں میں نئی بہو کی بے تمیزیاں، سرکشیاں اور حماقتوں کے شکوے شکایات اور عورتوں میں خصم پوت کے قصے، ساس نند کی برائیاں، کپڑوں، زیوروں اور بخششوں کے تذکرے غرض بہت کچھ زبانوں پر آتا ہے لیکن اس کا مقصد صرف بولنا چالنا اور زبان کا استعمال ہوتا ہے۔

عرف عام میں خواتین زیادہ باتونی ہوتی ہیں اور یہ کہاوت بھی غالباً انھیں سے مخصوص ہے کہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام لیکن اتنی سے بات تو مردوں میں بھی دیکھی جاتی ہے کہ جہاں انھوں نے دوسرے آدمی کو دیکھا اور گفتگو کے لئے بے چین ہوئے۔ یہ بے چینی اور بے کلی جذبہ معیت سے پیدا ہوتی ہے اور ساتھ سنگت کا یہ جذبہ اس حقیقت کا پورا ثبوت ہے کہ بولنا بھی ایک انسانی جبلت ہے جسے ماہرین نفسیات نے ابھی تک جبلتوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔ چنانچہ بولنے کی جبلت کا جذبہ مسرت (معیت) اور اس کا عمل رس زبان کی ایجاد ہے۔

میرے نزدیک زبان کے یہ تینوں وظیفے بھی آخر میں آکر صرف ایک بنیادی وظیفے میں ضم ہو جاتے ہیں اور وہ ہے بیان کائنات۔ انسان کو بیان خدا نے سکھایا ہے یعنی قوت بیان خالق کائنات نے بخشی ہے اور زبان انسان نے خود بنائی ہے اور اس لئے بنائی ہے کہ خدا کی تخلیق بیان کرے جس میں وہ خود بھی شامل ہے اور اس کا مخاطب بھی داخل ہے اور ہر اس شے کا بھی شمار ہے جو اس سے دور ہے یا اس کی اور اس کے مخاطب کی نظر سے اوجھل ہے۔

گویا انسان خدا کی تخلیق اور زبان انسان کی تخلیق ہے جو دنیا اور دنیا کے تمام مادی مظاہر بلکہ اس کے مجرد تصورات بھی بیان کرتی ہے۔ وہ جو اطلاعیں دیتی اور جو خبریں دیتی ہے وہ اسی عالم اور موجودات عالم کی ہیں۔ وہ جن لوگوں کو متاثر کرتی، جن کے جذبات ابھارتی اور جن سے کام لیتی

ہے وہ اسی عالمی ڈرامے کے کردار ہیں اور جس ساتھ سنگت میں وہ ایک انسان کا دوسرے انسان سے رابطہ قائم کرتی ہے وہ بھی اسی عالم کا تجربہ ہے۔ یعنی زبان دنیا کے واقعات اور حالات بیان کرتی، موجودات عالم کا حال سناتی اور اپنے سنانے والے (انسان) کے شخانہ دل کے عکس دکھاتی ہے۔

۳۔ زبان کے لباس:

تقریر اور تحریر

(آواز اور حرف)

زبان کے دو لباس ہیں جن میں ملفوف ہو کر یہ ایک انسان سے دوسرے انسان تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے بنیادی اور فطری لباس آواز ہے جو انسان کے گلے اور منہ سے نکلتی ہے۔ دوسرا لباس حرف ہے جس میں لپٹ کر یہ زمانی اور مکانی فاصلے طے کرتی ہے یعنی مستقبل کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے اور دور دراز کے مقامات تک لے جائی جاتی ہے۔ اس کا سبب غالباً حرف کا جادو ہے جو بیشتر لوگ تحریر (حرف) کو تقریر (آواز) پر ترجیح دیتے ہیں اور تلفظ وغیرہ کی صحت کے لئے لفظ کے مکتوبی روپ سے خود بھی سند لیتے ہیں اور دوسروں کے سامنے بھی سند کے طور پر اسی روپ کو پیش کر دیتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کے اس عمل کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان دنیا کے ہر معاملے میں سننے پر دیکھنے کو ترجیح دیتا ہے اور کان سے زیادہ آنکھ کا اعتبار کرتا ہے۔ لیکن زبان کے معاملے میں یہ حقیقت بالکل برعکس ہو جاتی ہے کیونکہ زبان بنیادی طور پر بولنے سننے ہی کے لئے وضع ہوئی ہے۔ اس کا پہلا اور اصل لباس آواز اور مواصلاتی آلہ کان ہے۔ دوسرا لباس حرف اور مواصلاتی آلہ آنکھ ہے چنانچہ آواز کو حرف پر اور کان کو آنکھ پر تقدم اور فضیلت حاصل ہے اور مخاطب بعید کے مقابلے میں مخاطب قریب ہی مقصود اول ہے۔ اس لئے اردو زبان میں صرف دو ہی صیغے متکلم اور مخاطب (میں، ہم، تو، تم) ہوتے ہیں۔

آواز کو حرف پر اور تقریر کو تحریر پر ترجیح حاصل ہونے کی وجوہ یہ ہیں۔

۱۔ زبان بہت پرانے زمانے میں ایجاد ہوئی تھی۔ تحریر اس کے بہت بعد کی ایجاد ہے چنانچہ دنیا میں آج بھی ایسی بہت سی زبانیں بولی جا رہی ہیں جو لکھی نہیں جاتیں۔

۲۔ بچہ لکھنے پڑھنے سے بہت پہلے بولنا سیکھتا ہے اور کسی تربیت کے بغیر فطری طریقے پر

اپنے ہی آپ سیکھتا ہے لیکن پڑھنے کی اسے باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔

۳۔ انسان لکھنے پڑھنے سے زیادہ بولنے سننے کا کام کرتے ہیں۔ زبان جس قدر بولنے سننے میں کام آتی ہے اتنی لکھنے پڑھنے میں نہیں آتی۔

۴۔ تقریر اندھیرے اجالے میں ہر وقت ممکن ہے۔ اس کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے لیکن تحریر روشنی تک ہی محدود رہتی ہے۔ اس کا سلسلہ تاریکی میں کٹ جاتا ہے۔

۵۔ تقریر میں جن طریقوں (مثلاً لب و لہجہ، زور اور تاکید، آواز کا اتار چڑھاؤ، وقفہ اور تسلسل، جوش اور گرمی وغیرہ) سے تاثیر پیدا کی جاتی ہے وہ تحریر میں کام نہیں آ سکتے۔

۶۔ تقریر کو تحریر میں منتقل کرتے وقت زبان کو ہموار بنانے کی فکر میں اس کا بہت سا حصہ حذف کر دینا پڑتا ہے جس سے فطری پن کی جگہ تصنع ابھر آتا ہے اور آواز میں جو زندگی کی گرمی ہوتی ہے حرف میں اس کی جگہ موت کی سی ٹھنڈک آ جاتی ہے۔

۷۔ آخری بات یہ ہے کہ لپی زبان کی آوازوں کو پوری طرح گرفت میں نہیں لے پاتی۔ حرف کا کوئی جامہ زبان کے قد پر موزوں نہیں ہو پاتا۔ یا اس میں کہیں سے جھول آ جاتا ہے یا وہ کہیں سے کس جاتا ہے۔ ویندریے کہتا ہے کہ آج تک کوئی لپی زبان کو ٹھیک ٹھیک قلم بند نہیں کر پائی ہے۔[۱] یہی وجہ ہے کہ جب کوئی تحریر پڑھی جاتی ہے تو نہ زبان کا اصلی تلفظ سننے کو ملتا ہے نہ اس کی ابتدائی تاثیر ہی محسوس ہو پاتی ہے۔

۵۔ زبان کے تعلقات:

الف۔ زبان اور سائنس

زبان اور سائنس میں وہی نسبت ہے جو زندگی اور مادے میں پائی جاتی ہے۔ ایک کا تعلق خدا کی مخلوق سے ہے اور دوسری کا انسانی مخلوق سے۔ سائنس کے اصول قدرتی، واضح اور اٹل ہوتے ہیں لیکن زبان کے اصول انسان کے بنائے ہوئے، مبہم اور لچک دار ہوتے ہیں اور موقع محل کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ قدرتی اصولوں کے پیش نظر کائناتی واقعات اور مادی حادثات کی پیش گوئیاں کی جا سکتی ہیں لیکن انسانی طرز عمل کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی خاص موقعے پر کیا ہو گا۔

۱۔ لینگویج ص ۲۳۳

مثلاً ایک بندوقچی کسی جنگل میں اپنے سامنے اچانک ایک شیر کو کھڑا پاتا ہے۔ اس وقت اس سے کئی قسم کا عمل سرزد ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ سے بندوق گر پڑے اور وہ خود بھی کانپ کر زمین پر ڈھیر ہو جائے یا وہ لپک کر قریب کے درخت پر چڑھ جائے یا وہ بندوق چھتیا کر شیر پر گولی چلا دے۔ غرض انسانی کردار پر ہم پہلے سے کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔

زبان انسان کی ایجاد ہے جس میں اس نے اسی قسم کی لچک رکھی ہے۔ زبان کی بنیادی آوازوں، لفظوں، معنوں اور گرامری ڈھانچوں میں جس قدر چھوٹ دی ہوئی ہے اور جتنا دھیما پن نظر آتا ہے سائنس میں اس کے عشر عشیر کی بھی توقع نہیں کی جا سکتی اور جتنی تبدیل شکلیں مختلف اجزائے زبان کی ملتی ہیں سائنس میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک زبان کچھ آوازوں کے مجموعے سے کام لے رہی ہے تو دوسری زبان میں اس کی چند آوازوں کی جگہ دوسری ہی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ مختلف زبانوں میں بعض الفاظ مشترک ملتے ہیں اور بیشتر مختلف اور بعض زبانوں میں ایک لفظ بھی مشترک نہیں ملتا۔ ایک لفظ کے کئی کئی معنی اور ایک معنی کے لئے کئی کئی لفظ تو ایک ہی زبان میں بھی مل جاتے ہیں۔ یہی حال گرامری ڈھانچے کا ہے کہ نہ صرف دو زبانوں میں مختلف ملتا ہے بلکہ خود ایک زبان میں بھی اس کی کئی تبدیل شکلیں ہو سکتی ہیں۔

اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے زبان میں سائنس کی سی قطعیت، وضاحت اور جبریت کی تلاش غلط ہے البتہ علم زبان (لسانیات) کے مطالعے میں سائنسی طریق کار (استقراء) سے صرف ایک حد تک کام لیا جا سکتا ہے۔

ب۔ زبان اور ادب

ادب یوں تو زبان کا ہی جزو ہوتا ہے لیکن اپنی کچھ ایسی خصوصیات بھی رکھتا ہے جن کے باعث وہ زبان سے الگ پہچانا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ زبان کا تعلق تقریر سے ہے یعنی زبان بولنے کے لئے وضع ہوئی ہے لیکن ادب تحریر سے قریبی نسبت رکھتا ہے اس لئے جو فرق تقریر اور تحریر میں ملتا ہے وہی زبان اور ادب میں بھی پایا جاتا ہے۔ تقریر کے بہت سے فالتو حصے تحریر میں حذف ہو جاتے ہیں اسی طرح ادب میں بھی زبان کا بہت بڑا حصہ ترک کر دیا جاتا ہے جس سے ڈھیلے پن کی جگہ گٹھاؤ آ جاتا ہے اور عدم تناسب اور عدم توازن کی جگہ تناسب اور توازن لے لیتا ہے۔

۲۔ زبان تحریر کی ایجاد سے پہلے اور اس کا ادب تحریر کی ایجاد کے بعد پیدا ہوا ہے۔ ادب زبان کی چھلی تجلی اور فنی سنوری شکل ہے جو قرینہ میں نہیں تحریر کی لوح میں ہی محفوظ ہو سکتی ہے اس لئے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی زبان میں ادب پہلے پیدا ہوا اور فن تحریر بعد میں ایجاد ہوا اور تحریر یعنی لپی کی ایجاد سے پہلے عوام کی نوک زبان پر محفوظ رہا، وہ محض غلط سمجھتے ہیں۔

ایسی ہی غلط بات ویدک زبان کے ماہر مستشرق اے اے میکڈانل نے اپنی کتاب "ویدک گرامر" کے دیباچے میں کہی ہے کہ ہندوستان میں فن تحریر تقریباً چھ سو قبل مسیح میں ایجاد ہوا۔ اس وقت رگ وید کا متن پہلی بار مکتوبی روپ میں منتقل کیا گیا۔ اس سے پہلے لوگ سینکڑوں سال تک اس کے بھجن نسل در نسل حفظ کرتے رہے تھے۔ میکڈانل کے بعد آنے والے مغربی ماہرین لسانیات اسی قول کو نہایت شدومد سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔ میرے نزدیک میکڈانل کا یہ مفروضہ نہایت مضحکہ انگیز ہے۔

اس بات کو یوں سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ قرآن مجید عربی ادب کا بہترین نمونہ بلکہ شاہکار ہے لیکن اس کی جو آیت جس وقت نازل ہوتی تھی کم و بیش اسی وقت قلم بند کر لی جاتی تھی۔ بعد میں انھیں مختلف مکتوبی آیات کو جمع کر کے ان میں ترتیب اور تنظیم قائم کی گئی اور پھر یہ عظیم کتاب تیار ہوئی اور جب یہ کتاب تیار ہو گئی تو اس کا حافظہ شروع ہوا اور لوگ اسے ازبر یاد کر کے حافظ قرآن بننے لگے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے کتاب کے مختلف اجزا کی کتابت ہوتی ہے اس کے بعد ان لکھے ہوئے اجزا کو ایک خاص ترتیب سے جمع کرتے ہیں پھر اس مرتب کئے ہوئے مجموعے کو کتاب کا نام دیتے ہیں اور سب سے آخر میں لوگ اس کتاب کو زبانی یاد کر کے حافظ بن جاتے ہیں۔

رگ وید بھی ایک ادبی کتاب یعنی شعری مجموعہ ہے جس میں مختلف شعرا کے کہے ہوئے بھجن جمع کئے گئے ہیں۔ اب یہ تو ممکن ہے کہ کوئی انسان رگ وید کے چند بھجن زبانی یاد کر لے یا چند لوگ مل کر مجموعی طور پر اس کے چند بڑا حفظ کر لیں لیکن مکمل رگ وید کو موجودہ شکل میں حفظ کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پہلے اس کے تمام بھجن اسی ترتیب اور دیوتاؤں کے ناموں کی اسی تقسیم کے ساتھ جمع کئے جاتے جس ترتیب اور تقسیم کے ساتھ یہ آج ملتے ہیں اور یہ ترتیب اور تقسیم صرف تحریری یا کتابی صورت میں ہی ممکن تھی۔ لیکن کتاب سینکڑوں سال کے بعد مختلف افراد کی صرف زبانی یادداشتوں کے بل پر مرتب نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے علاوہ رگ وید کے محاسن شعری پڑھنے اور سمجھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ نہ انھیں

کوئی زبانی سیکھ سکتا تھا، نہ زبانی یاد رکھ سکتا تھا اور نہ اشعار میں زبانی صرف ہی کر سکتا تھا۔ رگ وید میں عروض کا علم اور شعر گوئی کا فن دونوں اتنے ترقی یافتہ نظر آتے ہیں کہ ان کی محض زبانی تعلیم اور زبانی استعمال قطعی ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ میکڈانل کو جہاں جہاں اس کی بحروں میں کچھ ارکان کی کمی بیشی کا دھوکا ہوا ہے یا جہاں وہ کسی لفظ کے معنی نہیں سمجھ پایا ہے وہاں اس کا اصل سبب یہ رہا ہے کہ وہ الفاظ کے صحیح اور ابتدائی تلفظ تک نہیں پہنچ سکا ہے اور یوں اس نے اپنی نارسائی کے باعث رگ وید کے علم و فن کو بھی داغدار کر دیا ہے۔

ایڈگر اچ اسٹرٹ ایوانس کہتا ہے کہ ماہر زبان اس وقت تک قدیم تحریروں کا تجزیہ نہیں کر سکتا جب تک وہ ان کا صوتی ترجمہ نہیں کر لیتا یعنی ان کے اصلی تلفظ تک نہیں پہنچ جاتا[۱] اور امریکی ماہرین لسانیات کا امام بلوم فیلڈ بھی کہتا ہے کہ "ہم کو لازم ہے کہ تحریری علامات کو اصل گفتگو میں منتقل کرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لیں۔ ہم اس باب میں اکثر ناکام رہتے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ ملفوظی روپ کو ترجیح دینا چاہیئے۔"[۲]

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ خود رگ وید میں ایسی داخلی شہادت موجود ہے جو میکڈانل کے اس مفروضے کے خلاف جاتی ہے۔ میکڈانل کی ہی مرتب کی ہوئی "ویدک ریڈر" نامی کتاب میں اندر دیوتا کی تعریف میں کہا ہوا ایک بھجن بھی ملتا ہے جس میں شاعر نے لفظ "نوشتو" استعمال کیا ہے۔ جو مصدر نوشتن (لکھنا) سے مشتق اور فعل کی بدلی ہوئی شکل ہے اور جس مقام پر یہ استعمال ہوا ہے وہاں لکھنے ہی کے معنی دے رہا ہے کیونکہ شاعر اس بھجن کے لکھنے کے صلے ہی میں دیوتا سے انعامات طلب کر رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رگ وید کے مرتب ہونے سے بھی بہت پہلے جس وقت یہ بھجن تصنیف کئے جا رہے تھے ہندوستان میں فن تحریر رائج تھا۔

۳۔ زبان میں جو الھڑپن اور رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ اونچ نیچ بھی ملتی ہے لیکن ادب میں اس کی جگہ یکسانی اور ہمواری پائی جاتی ہے۔

۴۔ زبان کا دائرہ عمل بہت وسیع اور ادب کا دائرہ نہایت محدود ہوتا ہے کیونکہ ادب زبان کا صرف ایک جزوی استعمال کرتا ہے اور باقی حصے کو جو بہت بڑا ہوتا ہے غیر ادبی اور غیر شاعرانہ کہہ کر چھوڑ دیتا ہے۔ ادب کے الفاظ کا ذخیرہ، محاورات، مرکبات، روزمرے اور اسالیب بیان مخصوص اور منتخب ہوتے ہیں اور وہ انھیں کو بار بار کام میں لاتا ہے۔

۱۔ [illegible] لنگوئسٹک سائنس ص [illegible]
۲۔ لینگویج ص [illegible]

۵۔ زبان کا سب سے بڑا اور بنیادی مقصد اطلاع دہی اور خبر رسانی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے دوسرے مقاصد بھی ہیں لیکن وہ اس مقصد سے کمتر درجے پر ہیں البتہ ادب کا واحد مقصد حسن آفرینی ہے اور حسن آفرینی مخاطب کے جذبات کو متاثر کرنے کی بطور خاص کوشش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ایسے تمام حربوں سے کام لیا جاتا ہے جو جذبات کو تحریک دینے والے ہوتے ہیں۔

۶۔ زبان کا مرکز دیہات میں ہوتا ہے جو دوسری زبانوں کے اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رہتا ہے لیکن ادب شہروں میں پروان چڑھتا ہے جہاں کتنی ہی زبانیں بولی جاتی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے اس لئے دونوں کے معیار کی سند بھی ان کے انھیں مرکزوں سے ملی جاتی ہے یعنی ادبی معیار کی سند شہر سے اور زبان کے معیار کی سند دیہات سے ملی جاتی ہے۔

۷۔ زبان عوامی اور سماجی چلن سے تقویت پاتی ہے اور ادب مخصوص افراد یعنی شاعروں اور ادیبوں کی انفرادی پسند اور ناپسند کا تابع ہوتا ہے۔ ادیب اور شاعر جس لفظ، ترکیب، روز مرے یا محاورے کو چاہتے ہیں چلن سے خارج یا ٹکسال باہر قرار دے دیتے ہیں لیکن زبان میں اس قسم کا کوئی رجحان نہیں ملتا۔ ہر شخص اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر اس کے مطابق زبان استعمال کرتا ہے اور دوسروں پر کوئی قدغن نہیں لگاتا۔ گویا زبان میں جمہوریت کا رواج ہے اور ادب میں شخصیت پرستی، آمریت اور تانا شاہی کا دور دورہ ہے یعنی ایک طرح سے سردار شاہی نظام قائم ہے جس میں ہر سردار کے ماننے والے اسی کے حکم کے مطابق زبان کے استعمال میں ترک و اختیار سے کام لیتے ہیں۔

۸۔ زبان میں بیشتر عمومی اور اصلی معنی مراد لئے جاتے ہیں لیکن ادب اکثر خصوصی اور مجازی معنی سے کام لیتا ہے۔ اس میں بیان کو تشبیہ، استعارے، مجاز مرسل اور کنائے جیسے گھڑ ستون سے سجایا جاتا ہے۔

۹۔ زبان میں بالعموم حقیقت سے زیادہ تعلق رہتا ہے لیکن ادب میں بطور خاص تخیل کی وسعتیں اور مفروضوں کی دنیائیں آباد کی جاتی ہیں۔

ان بنیادی اختلافات کے باعث ماہرین زبان اور ادیبوں کے نقطۂ نظر میں بڑا بل پڑتا ہے چنانچہ جب کوئی ادیب تنگنائے ادب سے نکل کر چہلنائے زبان میں زبردستی گھس آتا ہے اور زبان کی لفظوں کو اپنے ادبی مفروضات اور نازک تخیلات سے رنگین اور دلکش بنانے کی دھن میں اپنی فکر و نظر کی تنگی کے باعث اس میں الجھن پیدا کرنے لگتا ہے تو یہ فرق بہت زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

مثلاً مغربی ممالک میں ادبی فکر و نظر رکھنے والے لوگوں نے صوتی تبدیلی کے بہت سے اسباب تجویز کر دیے جن میں آب و ہوا، زمین کی قدرتی بناوٹ، عمومی طرز زندگی اور افراد کا غلط تلفظ وغیرہ شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ زبان سے باہر صوتی تبدیلی کے اسباب کی تلاش ایک ادبیانہ کوشش ہی تھی۔ ایسے ہی خیالات ہمارے یہاں بھی ظاہر کئے گئے ہیں چنانچہ مختلف علاقوں میں زبان کی بنیادی آوازوں اور تلفظ میں فرق کے متعلق منشی سید احمد دہلوی فرہنگ آصفیہ کے دیباچے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"بعض ملکوں کے آدمیوں کی ساخت، وہاں کی آب و ہوا اور مقامات کے لحاظ سے ایسی واقع ہوئی ہے اور ان کی زبانوں یا ہونٹوں میں کچھ ایسا جھوک آ پڑا ہے کہ وہ بعض حرفوں کو ان کے اصلی مخارج سے نکالنے پر بالکل قادر نہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اہل عرب سے چ، پ، گ ادا نہیں ہوتا؟ کیا باعث ہے کہ ایران کے لوگ ٹ، ڈ، ڑ، ذ، زں کا تلفظ ادا نہیں کر سکتے؟ اہل پنجاب ڑ، ق کا تلفظ آسانی سے ادا نہیں کر سکتے اور ہندوستانی کیونکر کر سکتے ہیں؟ اس کا سبب یہی ہے کہ مقامی آب و ہوا اور ان کی زبان و دہن کی ساخت میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔

پس جس طرح آوازوں میں ساخت کلمات تلفظ کے لحاظ سے فرق پڑا اسی طرح بلحاظ آب و ہوا و بلحاظ خصائص ملکی تلفظ میں بھی فرق پیدا ہوا۔ کہیں کوہستانی اور میدانی مقامات کے اثر نے اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ کہیں کھادر، بانگر اور ریگستان کے پر تو نے اپنا سکہ بٹھایا ہے مثلاً پہاڑی حیوانات ہونگے تو ان کی آواز پہاڑوں کے کھنڈوں، اونچے نیچے ٹیلوں، گھاٹیوں اور آبشاروں میں ٹکرا کر اپنی گونج سے ایک ایسا سلسلہ اور لہر پیدا کرے گی کہ ان کی اصلی آواز کو جیسی وہ منہ سے صادر ہوئی تھی جس کا قائل نہیں رہنے دے گی بلکہ بلا ارادہ گنگری کا لطف حاصل ہو جائے گا۔ پہاڑی لوگوں کے گیت اس امر کے شاہد ہیں۔ علیٰ ہذا چٹیل میدانوں کے رہنے والوں کی آواز میں وہی ہمواری، سلاست اور روانی پائی جائیگی جو میدان کے لئے مخصوص ہے اور جیسے بانگر کے لوگوں میں کرختگی ہے ویسی ہی ان کے الفاظ میں بھی خشونت ہے جس طرح کھادر یا تری کے باشندوں میں نرمی ہے اسی طرح کی ان کے الفاظ میں بھی کمزوری اور ملائمت ہے۔ عرب جیسے خشک ملک کی زبان اونٹوں کی زبان سے کس قدر مشابہ ہے۔ انگلستان جیسے سمندری جزیرے کی بولی دریائی جانوروں سے کتنی مطابقت کھاتی ہے یہاں تک کہ حرفوں کی طرز تحریر میں بھی دریائی لہروں کا لطف آتا ہے۔ ایران کی سریلی بولی اپنے ملک کی معتدل آب و ہوا کا اثر کس خوبصورتی سے ثابت کر رہی ہے"[۲]

۱۔ بلومفیلڈ، لینگویج ص ۴۰۴ اور ویورنے۔ لینگویج ص ۵
۲۔ فرہنگ آصفیہ کمیٹی جلد اول دیباچہ ص ۱۱، ۱۲

لغت نگار نے مندرجہ بالا بیان میں مختلف زبانوں کی بنیادی آوازوں اور تلفظ میں فرق کی توجیہ لوگوں کے مزاجوں کے تغیر یا جسمانی ساخت، ان کے گلے اور منہ کے رگ پٹھوں کی بناوٹ، ان کی سرزمینوں کی جغرافیائی حالت اور آب و ہوا کے فرق سے کی ہے کہ بعض علاقوں کے لوگ دوسرے علاقے کی زبان کی آوازیں اپنے منہ اور گلے سے ادا نہیں کر سکتے۔ میدان کے رہنے والوں کی زبان میں وہاں کی زمین کی سی ہمواری ملے گی اور سلاست اور روانی اس پر مستزاد ہو گی۔ اکھڑ لوگوں کی زبان کرخت ہو گی اور نرم مزاج لوگوں کی زبان کے الفاظ میں بھی کمزوری اور ملائمت پائی جائے گی اور معتدل آب و ہوا کے باعث بھی زبان سریلی ہو جاتی ہے۔ منشی سید احمد دہلوی نے لوگوں کی زبانوں کو اپنے اپنے علاقے کے جانوروں کی آوازوں سے مشابہ بھی بتایا ہے۔ بعض پہاڑی لوگوں کے گیت پہاڑی حیوانات کی آوازوں سے ملتے ہیں۔ عربی زبان اونٹ کی آواز سے مشابہ ہے اور انگلستان کی بولی یعنی انگریزی دریائی جانوروں کی آوازوں سے ملتی ہے۔

یہ سب نری شاعری اور تخیل کی کارفرمائی ہے۔ کیونکہ میرے مشاہدے میں تو یہ آتا ہے اور یہی مشاہدہ سب کا ہے کہ جو عرب فارسی پڑھتا ہے وہ پ، چ، ژ، گ کی آوازیں بھی نکال لیتا ہے۔ جو ایرانی اور عرب وغیرہ انگریزی پڑھتے ہیں وہ ٹ، ڈ کی آوازیں بھی ادا کر لیتے ہیں۔ جو اہل پنجاب چاہتے ہیں وہ ذ، ق بھی بآسانی بول لیتے ہیں اور بچہ تو کسی کا ہو اور کسی علاقے کا ہو جس علاقے میں چھوڑ دیا جائے گا وہیں کی بولی بولنے لگے گا اور اسے اس بولی کی تمام آوازیں بالکل آسانی سے نکالنے لگے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک انسان کا گلا اور منہ دوسرے انسان کے گلے اور منہ سے بالکل ملتا ہے۔ علم تشریح الابدان کی رو سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے اور نفسیات کی رو سے ان کے ذہنوں میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ یہ صرف ایک ادیب کا رنگین تخیل ہے جو انسانی آوازوں میں کوہستان، میدان اور ریگستان وغیرہ کی ناہمواری اور ہمواری اور ریت کی روانی کی تصویریں دیکھتا ہے اور انسانی آوازوں میں حیوانی آوازیں سنتا ہے بلکہ حرفوں کے طرز تحریر سے دریائی لہروں کا لطف بھی لیتا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں ضمناً یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ زبانیں کھردری، ملائم اور سریلی بھی ہوتی ہیں اور یہ بھی شاعری ہے کیونکہ علم زبان میں کوئی ایسا اصول یا معیار نہیں ہے جس سے زبانوں کی خشونت، نرمی اور سریلے پن کا فیصلہ کیا جا سکے۔ زبانوں کی ان صفات کا تعلق انفرادی پسند اور ناپسند سے ہے اور پسند و ناپسند کی بات شعر و ادب میں کی جاتی ہے لسانیات میں نہیں چلتی۔ وجہ

یہ ہے کہ ایک ہی زبان ایک شخص کو کھردری لگتی ہے اور دوسرے کو نرم اور خوش آیند محسوس ہوتی ہے۔ مگر ہر کسی کو اپنی اپنی زبان تو ہر ایک کو نرم، شیریں اور سریلی لگتی ہے چاہے دوسرا اسے سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ہی کیوں نہ دے لے اور جو آپ کو زبان سے اس لئے پیار ہے کہ یہ خدا کی مخلوق کا تخلیقی کارنامہ ہے تو پھر ہر زبان آپ کے کانوں میں رس گھولے گی۔

ج۔ زبان اور زمین

زبان کا زمین سے گہرا رشتہ ہے کیونکہ زمین پر انسان بستے ہیں اور انسانوں کی آواز سے ہی زبان بنی ہے۔ زبان اور زمین کے رشتے کا استحکام اس حقیقت سے بھی ثابت ہے کہ دنیا کی ہزاروں زبانوں میں سے ہر زبان کا نام اس علاقے پر رکھا گیا ہے جس میں وہ بولی جاتی ہے۔ زبانوں کے ناموں کی اس سے ہٹ کر اور کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی کہ وہ منسلک ہوتے ہیں اور ان کی یہ نسبت زمین (علاقے) سے قائم ہوتی ہے۔ زبانوں کے یہ علاقے زمین کی طبعی ساخت یعنی ندی، پہاڑ، جنگل، ریگستان، سمندر وغیرہ کے باعث ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں اور اسی درمیانی دوری اور جدائی کے باعث ان میں رہنے والوں نے جو زبانیں ایجاد کیں وہ بھی ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں اور اب جو انسان ان علاقوں میں آباد ہیں وہ اتنی ہی زبانیں بول رہے ہیں جتنے ان کے علاقے ہیں۔ یہ خدا کی زمین کی وہ پہلی تقسیم تھی جو انسان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اب اگر ہم زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتے چلے جائیں تو ہمیں برابر برابر مختلف علاقے دیکھنے کو اور مختلف زبانیں سننے کو ملتی چلی جائیں گی یعنی علاقے اور علاقوں کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی بدلتی چلی جائیں گی۔

یہاں ضمناً یہ تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ ہندوستانی زبانوں میں دو نام ایسے ہیں جن میں بظاہر نسبت کا کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔ ان کی توجیہ دوسری ہے۔ ان میں سے ایک سنسکرت ہے جو بہت پرانی زبان کہلاتی ہے اور بعض مغربی ماہرین لسانیات کے نزدیک مردہ ہو چکی ہے لیکن میرے علم و یقین کی حد تک یہ ان قدیم تحریروں کا نام ہے جن کی بنیادی زبان وسط ایشیا کی سغدی ہے جس میں ہندوستان کی مختلف مقامی بولیوں کا پُٹ مل گیا تھا۔ یہ آریائی بولی کا وہ روپ ہے جو ہندوستان پہنچنے کے بعد اس سرزمین پر نکلا تھا۔ اس طور زبان کے الفاظ کو سندھی (ادغام) کے اصولوں سے آپس میں کچھ اس طرح مرغوب کر کے لکھا گیا ہے کہ اس کی سطریں طویل زنجیرے نظر آتی ہیں۔ ایسی ہی زنجیر دار سطریں چینی، تبتی لکھتے کی اور بھی کئی ہی زبانوں میں ملتی ہیں جن میں ہندوستانی قسم کے حروف بھی

استعمال ہوتے ہیں۔[1] یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ منفرد طرز تحریر دنیا کے اسی علاقے سے مخصوص ہے جس سے سنسکرت کا تعلق ہے۔ تحریر کے انھیں ذخیروں کو سنسکرت (لفظاً سانکل کا بنا ہوا روپ = زنجیر) کہا گیا جو آگے چل کر تحریر کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی نام پڑ گیا اور اب کوئی نہیں جانتا کہ یہ نام ابتدا میں اس طرز تحریر کو دیا گیا تھا جس میں یہ زبان منضبط کی گئی تھی۔

اس زبان کے سغدی الاصل ہونے کے ثبوت میں چند الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ سغدی میں واحد متکلم (میں) کو اَزُو بولتے ہیں جو اوستا میں اَزَم، قدیم فارسی میں اَدَم اور سنسکرت میں اَہَم لکھا ہوا ملتا ہے۔ یعنی سنسکرت تحریر کی "ہ" سغدی کی ز کی آواز کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی سغدی لفظ کو آج کل انگریزی میں (EGO) لکھتے اور ایگو بولتے ہیں بلکہ بعض ذہین حضرات تو اردو میں اسے انا بھی لکھ جاتے ہیں جبکہ رومن کا حرف جی (G) سغدی کی ز کی آواز کا ترجمان ہے۔ یہاں دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ سغدی کی آواز "ز" کو قدیم فارسی میں "د" سے لکھا گیا ہے جس سے ز اور د کا تبادل ہونا ثابت ہے اور جس سے دو فارسی الفاظ استاد اور استاذ (جمع اساتذہ) کے ایک ہونے کا بھی جواز نکلتا ہے بلکہ اس سے ضمناً یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ آریائی زبان میں ذ، ض، ظ وغیرہ کی کوئی آواز نہیں صرف ایک یعنی ز کی آواز ہے جسے آپ زفیری کہہ سکتے ہیں بلکہ اوستا کی لپی میں بھی صرف ز اور ژ کی آوازوں کے لئے حروف ملتے ہیں ذ کی آواز کے لئے کوئی حرف نہیں ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی نے جو فارسی میں "ذ" کی آواز کے وجود سے انکاری تھے فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اس کی بنیادی آوازوں کا علم بھی ملا عبدالصمد پارسی سے حاصل کیا تھا جو یقیناً اپنی زبان کا عالم تھا۔ مرزا غالب دہلوی صاحب عالم مارہروی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خواجہ نصیر الدین طوسی آٹھ حرف کا زبان فارسی میں نہ آنا لکھتے ہیں اور "ذال" نقطہ دار کا ذکر نہیں کرتے۔ لاؤ کوئی لغت فارسی ایسی بتایئے کہ جس میں "ذال" آتی ہو؟ گزاشتن و گزشتن و پذیرفتن سب "ز" سے ہیں۔ کاغذ دال مہملہ سے ہے۔ اس کا "ذال" سے لکھنا اور کاغذ کو اس کی جمع قرار دینا تعریب ہے نہ تحقیق۔ آذر اسم آتش بدال ابجد ہے نہ بذال ثخذ۔ کوئی لفظ متحد المخرج فارسی میں نہیں بلکہ قریب المخرج بھی نہیں۔ "تے" ہے "طوے" نہیں۔ "سین" ہے "ثے" "صاد" نہیں اور "صاد" نہیں۔ "ہائے ہوز" ہے "حائے حطی" نہیں یہاں تک کہ "قاف" نہیں۔ اس واسطے کہ غین متحد المخرج

۱۔ دی سیکس آف لینگویج ص ۱۲۶
۲۔ [illegible] ص ۱۰۷

بلکہ قریب المخرج ہے۔ "ز" سے "ذ" کے ہوتے "ذال" کیونکر ہو۔[1]

اب ایک اور لفظ لیجئے جو اوستا میں زست[2] (یعنی ہاتھ) قدیم فارسی میں دست، سنسکرت میں ہست اور ویدک میں دھست لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں پھر اوستا اور فارسی قدیم میں ز اور د کا تبادل ثابت ہوتا ہے بات ایک ہی ہے بلکہ دست تو آج کی فارسی میں بھی بولا جاتا ہے۔ اب آپ چاہیں اسے د اور ز کا تبادل کہیں چاہے د اور ذ کا بات ایک ہی ہے کیونکہ ایرانی زبان میں ژ کے علاوہ صرف ایک ہی آواز ملتی ہے جسے آپ عربی کے ز یا ذ کسی حرف سے بھی ظاہر کر سکتے ہیں۔ سنسکرت میں یہاں بھی ز کی آواز کے لئے پھر وہی ہ (ہست) کا حرف استعمال ہوا ہے جس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ سنسکرت کا حرف ہ دراصل ہائے ہوز نہیں ہے بلکہ سغدی کی آواز "ز" ہے۔ اس لفظ کی ویدک تحریر میں فارسی کی د ہندوستانی مہا پران (بھاری آواز) دھ سے ظاہر کی گئی ہے اور یہ اس لئے ہوا ہے کہ اکثر آریائی زبان کی ہلکی آوازیں ویدک اور سنسکرت کی تحریروں میں ان بھاری آوازوں کے حروف سے منضبط کی گئی ہیں جو اصلاً آریائی نہیں ہندوستانی ہیں جیسے فارسی ابر (بادل) سنسکرت ابھر، فارسی برادر (بھائی) سنسکرت بھراتر، سغدی ابود (ہو گیا) سنسکرت ابھوت وغیرہ۔

مندرجہ بالا مثالوں کے پیش کرنے سے میرا مدعا صرف یہ تھا کہ لفظ سنسکرت سب سے پہلے رگ وید کے ایک بھجن میں مجھے سانکل (زنجیر) کے بدلے ہوئے روپ کی حیثیت سے ملتا ہے۔ اس سے آگے چل کر یہ لفظ اس طرز تحریر کے لئے استعمال ہوا جو سانکل سے ملتی ہے اور آخر میں آ کر "مہا بھارت" کے سنسکرت روپ میں یہ پہلی بار زبان کے معنوں میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔

دوسری ہندوستانی زبان اردو ہے جس کا نام بظاہر نسبتی نہیں ہے کیونکہ اس سے کسی علاقے کی نسبت ظاہر نہیں ہوتی لیکن یہ ابتدائی نام نہیں ہے۔ اس زبان کا اصلی نام کھڑی بولی ہے اور کھڑی کا لفظ اس علاقے سے نسبت ظاہر کر رہا ہے جہاں یہ بولی جاتی ہے۔ اس کا نام اردو بعد میں پڑا اور اردو کی تاریخ اور توجیہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ جہاں نے جب ۱۶۴۸ء میں آگرے سے اپنی راجدھانی دلی کو منتقل کی تو وہاں پرانے شہر کے باہر ایک نیا محلہ بسا جس میں آگرے سے جانے والے لوگ آباد ہوئے۔ اس محلے کا نام اردو محلہ تھا۔[3] یہ آج کل کے شہروں کے

۱۔ خطوط غالب ص ۱۰۵ ۲۔ [illegible] ص ۷۹
۳۔ اتر پردیش (بھارت) کے شہر اٹاوے کے ایک محلے کا نام بھی اردو محلہ ہے۔ ایک زمانے میں جب سلطنت اودھ میں شامل تھا اس وقت یہاں سلطنت کی جانب سے ایک گورنر رہتا تھا اور یہ محلہ فوج کی چھاؤنی بھی تھا۔ اسی کا [illegible]

صدر، صدر بازار یا چھاؤنی کی طرح تھا۔ اس میں رہنے والے ہماری ہی زبان بولتے تھے جو وہ اپنے ساتھ آگرے سے لے کر دلی گئے تھے۔ چونکہ دلی کے پرانے شہر کی قدیم اور اصلی زبان کو "دہلوی" کہتے تھے اور یہ اس سے مختلف زبان تھی اس لئے وہ اسے امتیاز کی خاطر فارسی ترکیب کے ساتھ "زبان اردوئے معلّیٰ" کہنے لگے جو کتابوں میں "زبان اردوئے معلّیٰ" کی ترکیب میں نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ معلّیٰ (معلّیٰ) کا لفظ بول چال سے ساقط ہو گیا تو اسے محض "زبانِ اردو" کہنے لگے چنانچہ میر امن دہلوی اپنی کتاب "باغ و بہار" میں اسی فارسی مرکب کا ترجمہ کر کے اسے اردو کی زبان کہتے ہیں جس میں اردو سے اردو معلّیٰ (اردوئے معلّیٰ) یعنی علاقہ مراد ہے۔ آگے چل کر اس فارسی ترکیب سے لفظ زبان بھی ساقط ہو گیا اور پھر زبان کا نام ہی اردو پڑ گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی واقعہ ہے جیسے چین کے شہر "شنگھائی" میں بننے والے ریشمی کپڑے کو شنگھائی کا کپڑا کہنے کی جگہ صرف شنگھائی کہتے ہیں۔ انگریزی میں لفظ "چائنا" سے ملک چین کے ساتھ ساتھ وہاں بننے والے چینی مٹی کے برتن بھی مراد ہوتے ہیں۔ شہر سروہی (راجپوتانہ۔ بھارت) میں بننے والی تلوار کا نام بھی سروہی پڑ گیا۔ اسی طرح دلی کے اردو محلے میں بولی جانے والی زبان بھی اردو کہلانے لگی اور علاقے کا نام ہی زبان کا نام ہو گیا۔

۲۔ زبان اور کلچر

زبان جس علاقے میں بولی جاتی ہے وہ اس زبان کا علاقہ کہلاتا ہے اور وہاں کے باسی اس زبان کا سماج کہلاتے ہیں۔ زبان اور اس کا سماج دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے بغیر دوسری کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کون سی پہلے اور کون سی بعد میں وجود میں آئی۔ ہر لسانی سماج میں مختلف طبقے ہوتے ہیں۔ امیر، غریب، پیشہ ور، ملازم، اہلِ حرفہ، سوداگر، کاشتکار، مزدور، تاجر، شاعر، ادیب، اہلِ فن، مرد، عورت، بالے، بوڑھے، عالم اور جاہل وغیرہ۔ اس کے باوجود پورے لسانی سماج کا ایک مخصوص کلچر ہوتا ہے جو دوسرے سماج کے کلچر سے کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور رکھتا ہے[1]۔ مشہور ماہر لسانیات ایڈورڈ سپیر نے کلچر کی یوں تعریف

[1] اگر شہر سے دور چھاؤنی مطلب یہ نکلا کہ جس طرح آج چھاؤنی، کینٹونمنٹ اور صدر یا صدر بازار سے وہ مقام مراد ہوتا ہے جہاں فوج رہتی ہے یا کبھی رہتی تھی یا رہتی ہو اور چھاؤنی کو صدر بازار بھی کہتے ہیں، اسی طرح شاہی زمانے میں یہ مقام اردو محلہ کہلاتا تھا۔ اس محلے کی زبان دلی میں [illegible] بولی جاتی تھی ہم اسے اردو کہتے ہیں اور [illegible] میں بھی اس علاقے یعنی اردو محلے کی زبان ہی جانی جاتی ہے لیکن [illegible] سے دلی کے اردو محلے کو [illegible] کے اردو محلے پر تقدم حاصل ہے۔ اردو زبان کا نام دلی ہی کے اردو محلے پر پڑا ہے۔

[2] لینگویج اینڈ لنگوئسٹکس ص [illegible]

کی ہے۔ سماج جو کچھ سوچتا یا کرتا ہے وہی اس کا کلچر کہلاتا ہے[1]۔ اور سماج جو کچھ سوچتا ہے یا کرتا ہے وہ اس کی زبان سے جھلکتا ہے یعنی جو سماج کا کلچر ہوتا ہے وہی زبان کا بھی کلچر کہلاتا ہے۔ بقول ولیم جے اوڈونل زبان کلچر کا وسیلہ اظہار ہے[2] اور چارلس ہاکٹ کہتا ہے کہ انسانی زبان کی روایات ایک پود سے دوسری پود کو نسلی طور سے نہیں کلچر (تعلیم) کے ذریعے سے منتقل ہوتی ہیں[3]۔

مثال کے لئے اردو میں ملاقات کے وقت "آداب عرض" کہتے ہیں جس سے واضح ہے کہ اس کے کلچر میں ادب و احترام زیادہ ملحوظ خاطر ہے۔ عربی میں "السلام علیکم" کہتے ہیں یعنی عربی زبان کا کلچر جان کی سلامتی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور انگریزی میں "گڈ مارننگ" اور "گڈ ایوننگ" وغیرہ کہنے کا سبب یہ ہے کہ اس کے کلچر میں موسمی بے اعتباری کے باعث صبح شام کا وقت اچھی طرح گزر جانے ہی کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔

عربی میں ایک اونٹ کے کتنے ہی نام رکھے گئے ہیں کیونکہ عربی کے کلچر میں اس جانور کی اہمیت اور افادیت بہت زیادہ ہے۔ انگریزی میں سور کے کتنے ہی نام رکھے گئے ہیں مثلاً بور، پگ، سوائن، ہوگ، سو، پورکر وغیرہ اور یہ حقیقت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ انگریزی کے کلچر میں یہ جانور نہایت عزیز اور مقبول ہے اور بہت شوق سے پالا اور کھایا جاتا ہے۔ اردو کے کلچر میں پان کھانے کے رواج کے پیشِ نظر اس سے متعلق کتنے ہی ظروف ایجاد ہوئے ہیں جیسے پاندان، پیکدان، اگالدان، خاصدان وغیرہ۔ اس کلچر کی اور بہت سی خصوصیات جو دوسری زبانوں کے کلچروں میں نہیں ملتیں میری کتاب "باغ و بہار پر ایک نظر" کے تیسرے باب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

سپیر کہتا ہے کہ زبان سے کلچر کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ زبان کلچر کے حدود کو بھی پار کر جاتی ہے۔ بالکل غیر متعلق زبانیں ایک ہی کلچر میں شریک ہیں اور مختلف کلچر ایک ہی زبان سے تعلق رکھتے ہیں[4]۔ لیکن یہاں سپیر کو دو کلچروں کے تجزیاتی تقابل میں دھوکا ہوا ہے اور وہ ان کے اختلافات اچھی طرح نہیں سمجھ پایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح پڑوسی زبانوں کے اختلافات تعداد میں کم اور نوعیت میں بھی خفیف اور معمولی سے ہوتے ہیں اسی طرح پڑوسی کلچروں میں بھی باریک سا فرق ملتا ہے جو بغور مطالعے اور گہرا تجزیے کا متقاضی ہوتا ہے۔

[1] لینگویج ص [illegible]
[2] آسپیکٹس آف لینگویج ص [illegible]
[3] اے کورس ان ماڈرن لنگوئسٹکس ص [illegible]
[4] لینگویج ص [illegible]

۴۔ زبان اور نسل انسانی

زبان کا نسل سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی خاص نسل کی کوئی مخصوص زبان بھی ہو۔ ایک ہی زبان کے سماج میں مختلف نسلوں کے افراد بستے ہیں لیکن سبھی اسے استعمال کرتے ہیں اور زبان اسی کی ہوتی ہے جو بولتا ہے۔ اس بات کو دوسری طرف سے دیکھئے تو یہ نظر آتا ہے کہ ایک نسل کے افراد جس جس لسانی علاقے میں آباد ہیں اسی کی زبان بول رہے ہیں۔ چنانچہ زبان اور نسل میں کوئی طبعی مناسبت یا تعلق نہیں ہے۔ اس بارے میں سپیر کا خیال درست ہے[1] ولیم ایتھو سٹل کا بھی[2] اور جان لیونز کا بھی[3]۔

۱۔ لینگویج ص ۲۲۰

۲۔ دی سٹڈی آف لینگویج ص ۲۰

۳۔ لینگویج اینڈ لنگوئسٹکس ص ۲۶

دوسرا باب

زبان کا زمانی اور مکانی مطالعہ

۱۔ زبان کا زمانی مفروضہ:

زبان جس طرح پورے صفحۂ ارض کو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک چھائے بیٹھی ہے اسی طرح یہ اپنی ابتدا سے آج تک اتنے طویل عرصے پر پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا شمار انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں رہی لیکن پچھلی صدی عیسوی میں مغربی ماہرین لسانیات نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی بجائے کہ "زبان کیا ہے؟" یہ سوچنا شروع کر دیا کہ زبان کب اور کیسے پیدا ہوئی اور دنیا کی اتنی بہت سی زبانیں کس طرح وجود میں آگئیں؟ ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے بھی اس مکتبۂ خیال کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ البتہ اس کی باضابطہ ابتدا اس وقت سے ہوئی جب ایک مستشرق سر ولیم جونس نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بنگال میں جج ہو کر آیا تھا برصغیر میں رہ کر سنسکرت کا مطالعہ کیا اور ۱۷۸۶ء میں اس نے پہلی بار مغرب کے ماہرین لسانیات کو یہ اطلاع دی کہ سنسکرت یونانی اور لاطینی سے بہت مشابہ ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ زبانیں کسی ایک ہی قدیم زبان سے نکلی ہیں۔ اس کے نتیجے میں لوگ مختلف زبانوں کا موازنہ اور مقابلہ کرنے پر چل پڑے اور دو دو زبانوں کی مشترک خصوصیات دیکھ دیکھ کر یہ تعین کرتے چلے گئے کہ یہ کسی ایک ہی قدیم زبان کی دو شاخیں ہیں جو رفتہ رفتہ تبدیل ہو کر دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔

اس تقابلی مطالعے کی روشنی میں ایک قدیم فرضی زبان ہند یورپی کا قدرے قلیل سا نقش بھی گھڑ لیا گیا اور اس میں ہندوستان اور یورپ کی بہت سی زبانیں شامل کر لی گئیں۔ اسی طرح دنیا کی دوسری زبانوں کے بھی شجرے بنائے گئے۔ اس مطالعے کو تقابلی طریقہ کہا گیا اور ان تحقیقات کا نام تقابلی لسانیات رکھا گیا۔ اسی کو تاریخی لسانیات بھی کہتے ہیں۔

پوری پچھلی صدی یعنی انیسویں صدی عیسوی میں تاریخی لسانیات کی بڑی دھوم رہی اور

اسے اتنی اہمیت دی گئی کہ "زبان کیا ہے؟" کے جواب کو اسی کا تابع بنا دیا گیا یعنی کسی زبان کی ماہیت سمجھنے کے لئے اس کی تاریخ کا علم ناگزیر سمجھ لیا گیا۔ اس تاریخی رجحان کا اثر کم و بیش آج تک چلا آیا ہے چنانچہ مغرب کا ہر ماہر لسانیات اپنی گفتگو کی ابتدا اس جملے سے کرتا ہے کہ زبان بدلتی رہتی ہے اور اس کی یہ تبدیلی مستقل اور باقاعدہ ہے۔ ان میں سے چند ماہرین کے اقوال میں نیچے پیش کر رہا ہوں۔

ایڈورڈ سپیر اپنی کتاب میں کہتا ہے "زبان کے تاریخی مطالعے نے ہمارے لئے حتمی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ زبان نہ صرف رفتہ رفتہ بلکہ مستقل طور پر بدلتی رہتی ہے۔"[1]

اوٹو جیسپرسن اپنی کتاب کے پہلے جملے میں کہتا ہے "آج کل زبان کی جو نمایاں خصوصیت سمجھی جاتی ہے وہ اس کا تاریخی کردار ہے۔"[2]

بلوم فیلڈ اپنی کتاب میں کہتا ہے "زبانیں مرور ایام کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔"[3]

ہاکٹ کہتا ہے "زندہ زبان کے ڈھانچے میں تدریجی تبدیلی اس کی زندگی کا ایک حصہ ہے اور مسلسل اور سلاک ہے۔"[4]

جیمس اینڈرسن کہتا ہے "تمام زبانیں برابر بدل رہی ہیں۔"[5]

جان لیونز کہتا ہے "اسکالر کافی عرصے سے جانتے ہیں کہ زبانیں وقت کے ساتھ بدل جاتی ہیں" اور "زبان کی تبدیلی عالمگیر، مسلسل اور بڑی حد تک باقاعدہ ہے۔"[6]

نیل اسمتھ کہتا ہے "زبانیں وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔"[7]

تاریخی لسانیات میں تقابلی طریقے سے مطالعہ کرنے کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ جب ایک زبان وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جاتی ہے تو ایک موڑ ایسا آجاتا ہے جہاں وہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے نزدیک زبانوں میں پائی جانے والی مشترک خصوصیات کی توجیہہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ کسی ایک ہی زبان کی یادگار ہیں جو ان دو زبانوں میں تقسیم ہو کر خود مٹ چکی ہے۔ چنانچہ تاریخی لسانیات کا موضوع خاص یہ ہو گیا کہ زبانوں کی تبدیلی کا طریق کار معلوم کرنے اور تبدیلی کے اسباب کا سراغ لگائے۔ اس سلسلے میں دو ماہرین کے اقوال ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ لینگویج ص [illegible] ۲۔ لینگویج ص [illegible] ۳۔ لینگویج ص [illegible]
۴۔ اے کورس ان ماڈرن لنگوئسٹکس ص [illegible] ۵۔ اسٹرکچرل آسپکٹس ص [illegible]
۶۔ لینگویج اینڈ لنگوئسٹکس ص [illegible] ۷۔ ماڈرن لنگوئسٹکس ص [illegible]

پال کپارسکی کہتا ہے "تاریخی لسانیات کے ماہر کا پہلا کام یہ سمجھنا ہے کہ زبانیں کس طرح بدل جاتی ہیں۔"[1]

جیمس اینڈرسن کہتا ہے "تاریخی لسانیات اس بات پر زور دیتی ہے کہ زبان کیوں بدلتی ہے اور کس طرح بدلتی ہے۔"[2]

اس فکری رجحان نے علم زبان میں ایک طرح سے شاعری کا آغاز کر دیا اور اس قسم کے خیالات ظاہر ہونے لگے کہ آج کل کی سب زبانیں کسی ایک ہی زبان سے نکلی ہیں۔ جس طرح ایک درخت وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی شاخوں میں بٹ جاتا ہے اسی طرح زبان بھی رفتہ رفتہ تبدیل ہو کر کئی زبانوں میں بٹ جاتی ہے اور خود صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ تقسیم و کثرت کا خیال نباتات سے ماخوذ ہے یا پھر حیاتیات کے ایک خلیے والے احیا کے عمل تقسیم کا عکاس ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ از خود دو حصوں میں بٹ جاتا ہے اور پھر ان کا ہر حصہ بڑھتے بڑھتے خود ایک کل بن کر ایک وقت پر اپنے آپ کو اسی طرح تقسیم کر لیتا ہے اور یہ عمل تقسیم علی الاتصال جاری رہتا ہے۔

برصغیر پاک و بھارت میں پراکرت کے قدیم گرامر نویس بھی یہ کہتے تھے کہ ہندوستان کی تمام موجودہ زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں اس لئے لوگ پرانے زمانے سے سنسکرت الفاظ کے برابر والے الفاظ رکھ کر یہ اشتقاق دکھاتے چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ وہ سنسکرت "آشا" سے اردو "آس"، سنسکرت "شکتی" سے اردو "سکت"، سنسکرت "پشچاتاپ" سے اردو "پچھتاوا(۱)" اور سنسکرت "وارتالاپ" سے اردو "بہلاوا(۱)"، سنسکرت "سنتاپ" سے اردو "ستاوا(۱)" کو مشتق کہنا پسند کریں گے حالانکہ ان الفاظ کا اشتقاق اس کی مخالف سمت میں بھی بالکل اسی طرح دکھایا جا سکتا ہے یعنی آس سے آشا، پچھتاوا سے پشچاتاپ، بہلاوا سے وارتالاپ اور ستاوا سے سنتاپ کو مشتق کر سکتے ہیں اور میرے علم اور یقین کی حد تک یہی صحیح بھی ہے۔ پراکرت کے قدیم گرامر نویسوں کی تائید میں ہی اردو ڈکشنری بورڈ کراچی (اقدام ترقی اردو بورڈ کراچی) کے اردو لغت میں اردو الفاظ کا اشتقاق بالالتزام سنسکرت سے دکھایا جاتا ہے۔

پھر مغرب کے ماہرین لسانیات کے زیر اثر اردو کو جس دوسری نام نہاد قدیم زبان سے مشتق دکھانے کی کوششیں کی گئیں وہ جنوبی ہندوستان کی "دکنی" بولی ہے جو آج تک بولی جاری ہے اور قدیم نہیں ہے کیونکہ تاریخی لسانیات والے قدیم زبان اس کو کہتے ہیں جس کے

۱۔ [illegible] ص [illegible] ۲۔ ہسٹاریکل لنگوئسٹکس ص [illegible]

بولنے کا چلن دنیا سے اٹھ گیا ہو۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کے لکھے ہوئے اس مقدمے کو بہت زیادہ اور اولین اہمیت حاصل ہے جو انھوں نے دکنی زبان کی "سب رس" نامی کتاب پر لکھا تھا۔ اس کے چند اقتباسات جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اردو دکنی سے نکلی ہے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

"الفاظ و محاورات کے علاوہ اس کتاب سے قدیم دکنی یا اردو کی صرف و نحو اور بعض الفاظ کے تغیر و تبدل کا پتا بھی لگتا ہے۔"

"یہ کتاب ادبی نظر سے قدیم اردو میں خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔"

"سب رس اردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو ادبی اعتبار سے بڑا درجہ رکھتی ہے۔"

"اس کی زبان قدیم ہے اور پرانے الفاظ اور محاورات آج کل سمجھ میں نہیں آتے۔"

جوز شمٹ (۱۸۴۳ء تا ۱۹۰۱ء) نے ۱۸۷۲ء میں ہندیورپی زبانوں کا موازنہ کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں دریا کی موج سے استعارہ لے کر یہ بیان کیا تھا کہ ہندیورپی زبان کی کوئی سی دو شاخوں میں مخصوص مشترک مشابہتیں مل سکتی ہیں اور یہ مشابہتیں ان شاخوں میں کثرت سے ملتی ہیں جو باہم قرب مکانی رکھتی ہیں۔ اس کے اس نظریے کو "موج دریا کا نظریہ" کہتے ہیں۔ اس کے مطابق مختلف لسانی تبدیلیاں موجوں کی طرح کسی لسانی علاقے میں پھیل جاتی ہیں اور ہر تبدیلی پچھلی تبدیلی کے متاثرہ علاقے سے کچھ آگے نکل جاتی ہے۔ ان متواتر موجوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمسایہ علاقے ایک دوسرے سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں اور جیسے جیسے ان میں دوری بڑھتی جاتی ہے اختلاف زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔[1] لنگوسٹک سروے آف انڈیا کے مولف جارج گریرسن نے مدھیہ دیس میں حملہ آور آریاؤں کی متواتر تین لسانی ٹکڑیوں میں آمد کا جو نظریہ بیان کیا ہے اس پر جوز شمٹ کے اس موجی نظریے کی چھاپ نظر آتی ہے۔

ایڈورڈ سپیر نے اپنی کتاب "لینگویج" کے ساتویں باب میں جس کا ذیلی عنوان اس نے بہاؤ رکھا ہے تاریخی پس منظر میں زبانوں کی پیدائش نہایت تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس نے زبان کو تاریخی پیداوار بتایا ہے اور دریا کے بہاؤ کا استعارہ لے کر زبان کا تقسیمی رجحان ثابت کرنا چاہا ہے کہ جس طرح دریا کی دھار رفتہ رفتہ دو حصوں میں بٹ جاتی ہے اسی طرح زبان اپنے بہاؤ میں کئی کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ ایک ہی نسل اور مقام کے رہنے والے وہ انسان جن کی مادری زبان بھی

۱۔ بلوم فیلڈ۔ لینگویج ص ۳۱۷ اور جیمس [illegible] ص ۸۸

ایک ہے اور جو ایک ہی سماجی حلقے میں چلتے پھرتے ہیں بالکل ایک سی زبان نہیں بولتے۔[1] جب بولنے والوں کی انفرادی خصوصیات لاشعوری طور پر اکٹھی ہو کر کوئی ایک رخ اختیار کر لیتی ہیں تو زبان کا ایک بہاؤ بن جاتا ہے اور وہ کئی دھاروں میں بٹ جاتی ہے۔[2] یہ دھاریں رفتہ رفتہ مکمل زبان کی شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔[3] اس طرح سپیر کے نزدیک زبان کا اندرونی رنگ برنگا پن اور اس کے بولنے والوں کے لسانی اختلافات ہی اس کی تقسیم در تقسیم کا اصل سبب ہیں۔ یہی بات جان لیونز کہتا ہے کہ "کسی لسانی سماج کے بہت تھوڑے سے لوگوں کی زبان میں جو خصوصیات کسی ایک وقت میں ملتی ہیں وہ دو ایک نسلوں کے بعد اکثریت میں پھیل سکتی ہیں۔"[4]

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو زبانوں کے ملنے سے ایک تیسری زبان اسی طرح پیدا ہو جاتی ہے جس طرح دو انسانوں (مرد اور عورت) کے ملنے سے تیسرا انسان وجود میں آجاتا ہے۔ پھر زبانوں کے شجرے بھی گویا انسانوں ہی کے سے کھنچے ہیں جن میں کئی کئی زبانیں شامل ہیں۔ یہ زبانیں آپس میں سگی رشتہ دار ہوتی ہیں جن میں ماں بیٹی کا بھی رشتہ ہوتا ہے اور بہنوں بہنوں کا بھی، خالہ بھانجی کا بھی اور نانی نواسی کا بھی۔ اسی لئے ان میں بہت سی مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہ گویا انسانی ازدواج اور وراثت کا استعارہ ہے۔

غرض یہ ہے کہ کسی ایک قدیم زبان یعنی مورث زبان، زبان کی پیدائش، اس کی رشتہ داری، عمر، وفات اور مشترک خصائص و خصائل وغیرہ کے تصورات سب فرضی اور مجازی باتیں ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ دنیا میں آج تک جتنی زبانیں بولی جا رہی ہیں وہ سب کی سب ماضی بعید میں کسی وقت بنائی گئی ہیں اور جب سے تاریخ ہمیں ماضی کا حال بتانے لگی ہے اس وقت سے اب تک نہ کوئی زبان گھڑی گئی ہے نہ مری ہے۔ زبان اتنی آسانی سے مر بھی نہیں سکتی جتنی آسانی سے لوگ اسے مارنا چاہتے ہیں کیونکہ جب تک کسی زبان کے دو بولنے والے بھی زندہ ہیں اس کی وفات ناممکن ہے۔ پھر تاریخ ایک زبان سے دوسری زبان کے پیدا ہونے کا حال بھی نہیں بتاتی۔ زبانوں کے باہمی اختلافات کے پیش نظر ابھی تک یہ بھی مکمل طور پر ثابت نہیں ہو سکا ہے اور نہ دل ہی اس بات سے مطمئن ہو پاتے ہیں کہ دنیا کی تمام زبانیں کسی ایک قدیم ترین زبان سے مشتق ہوئی ہیں۔ بقول شاہ حمید آبادی:

۱۔ لینگویج ص ۱۴۷ ۲۔ لینگویج ص ۱۵۵ ۳۔ لینگویج ص ۱۶۰
۴۔ لینگویج اینڈ لنگوسٹکس ص ۲۰۵

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

ایڈورڈ سپیر جہاں ایک طرف یہ کہتا ہے کہ "یہ ہر طرح کی حقیقت کی طرح یقینی بات ہے کہ جدید آئرش، انگریزی، اطالوی، یونانی، روسی، ارمنی، فارسی اور بنگالی جیسی زبانیں جو آپس میں بہت کم مشابہت رکھتی ہیں ان دھاروں کے آخری نقطے ہیں جو دھندلے ماضی میں کسی مقام پر مل کر ایک ہو جاتی ہیں"[1] ۔ وہ دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ "ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ زبانوں کی رشتے داری کا ثبوت اتنا کافی نہیں ہے کہ حتمی طور سے ان کے مشترک ماخذ کا نتیجہ نکال سکیں"[2] ۔

اسی طرح جوز لیونز زبانوں کے مشترک الاصل ہونے کے متعلق اپنا شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے ۔ "ہمیں علم نہیں ہے کہ کبھی کوئی ایک مورث زبان بھی تھی جس سے تمام انسانی زبانیں نکلی ہیں ...... ہو سکتا ہے کہ تمام زبانیں ماضی بعید میں ۔ شاید پانچ لاکھ سال پہلے ۔ کسی ایک مورث زبان تک پہنچ جائیں اور یوں ایک ہی خاندان کی ارکان ہوں لیکن ان کے ڈھانچے کی نمایاں مشابہتیں جو پہلی نظر میں اس نظریے کی تائید کرتی معلوم ہوتی ہیں اس تقسیم اور اتصال کی تشریح نہیں کر پاتیں"[3] ۔

تاریخی لسانیات میں جو تقابلی طریقہ استعمال ہوتا ہے وہ یہ فرض کرتا ہے کہ آج کل کی زبانوں میں جو خصوصیات مشترک پائی جاتی ہیں وہ اس قدیم زبان کی یادگار ہیں جو ان کی مورث تھی اور جس سے یہ پیدا ہوئی ہیں ۔ اس طرح یہ طریقہ ضمناً یہ تسلیم کرتا ہے کہ ،

۱ ۔ آج کی ہر زبان یا زبان کی ہر شاخ مورث زبان سے براہ راست تعلق رکھتی ہے گویا مورث زبان مکمل طور پر یکساں زبان تھی جس میں کوئی تیرگی یا بولیوں کا وجود نہیں تھا اور

۲ ۔ مورث زبان تاریخ کے کسی موڑ پر پہنچ کر یکایک دو یا کئی شاخوں میں بٹ گئی جن کا پھر آپس میں کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا اور اس لئے وہ کبھی ایک دوسرے پر اپنے اثرات نہیں ڈال سکیں ۔

مندرجہ بالا دونوں باتیں آج کے لسانی مشاہدے اور مطالعے کے خلاف ٹھیرتی ہیں ۔ نہ کوئی زبان مکمل طور پر یکساں ہے اور نہ ایک دوسرے کے اثرات سے ہی محفوظ ہے ۔ اس وجہ سے تقابلی طریقہ ناقص ہے جو آج لسانی مطالعے میں ہمیں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچا پاتا ۔

اب میں اس بات کی طرف آتا ہوں کہ آخر زبان کی یہ تبدیلی جس کا اتنا شور مچایا جا رہا

۱ ۔ لینگویج ص ۱۵۰ ۔ ۲ ۔ ایضاً ص ۱۵۲ ۔ ۳ ۔ لینگویج اینڈ لنگوئسٹکس ص ۶۰ ۔

ہے کون سا لسانی حادثہ ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے اور مغرب کے ماہرین لسانیات اس سے پہلی بار کب واقف ہوئے ۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ مغربی اسکالر زبان کی تبدیلی کے واقعے سے اول اول ۱۷۸۶ء میں باخبر ہوئے جب سر ولیم جونس نے انھیں اطلاع دی کہ سنسکرت، یونانی اور لاطینی سے مشابہ زبان ہے ۔ اسی وقت سے زبانوں کا تقابلی مطالعہ شروع ہوا اور تاریخی لسانیات کی داغ بیل پڑی ۔ اس مطالعے میں مختلف زبانوں کے الفاظ پر غور کیا گیا اور ان کے صوتی اختلافات یعنی صوتی تبدیلیاں نوٹ کی گئیں کہ فلاں زبان کے فلاں لفظ کی فلاں آواز دوسری زبان کے اس لفظ میں اس آواز سے بدل گئی ہے ۔ مراد یہ ہے کہ زبان کی تبدیلی کے نظریے کی ابتدا صوتی تبدیلیوں کے مطالعے سے ہوئی ۔ اس بارے میں ماہرین لسانیات کی چند آرا ملاحظہ کیجئے ۔

۱ ۔ ایڈورڈ سپیر کہتا ہے ۔ "لسانیاتی تاریخ کا مرکزی مسئلہ تدریجی صوتی تبدیلی ہے ۔ صوتی قوانین لسانیات کے مواد و موضوع کا بہت بڑا اور بنیادی حصہ ہیں"[1] ۔

۲ ۔ اوٹو یسپرسن کہتا ہے "اس ناقابل تردید حقیقت کی تشریح کے لئے کہ زبانیں مرور ایام کے ساتھ بدل جاتی ہیں، بہت سے نظریات پیش کئے گئے ہیں ...... سب سے زیادہ توجہ صوتی تبدیلی پر دی گئی ہے"[2] ۔

۳ ۔ ولیم فیلڈ کہتا ہے "تاریخی لسانیات کا طریقہ متعین کرنے کے لئے پہلا کام یکساں صوتی مشابہتیں تلاش کرنا تھا ۔ ان مشابہتوں کو ہم تبدیلی کے عنصر کا نتیجہ سمجھتے ہیں جسے صوتی تبدیلی کہتے ہیں"[3] ۔

۴ ۔ جیمس ایبٹرسن کہتا ہے "لسانی تبدیلی میں صوتی تبدیلی کا عنصر بہت غالب رہا ہے"[4] ۔
غرض مختلف زبانوں میں ایک ہی لفظ کی بعض مختلف آوازوں سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ زبانوں میں یہ تبدیلیاں جنھیں صوتی تبدیلیاں کہا گیا ہے مرور ایام سے پیدا ہو گئی ہیں اس لئے یہ نظریہ قائم کر لیا گیا کہ زبان وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف بدلتی رہتی ہے بلکہ بدلتے بدلتے ایک دن کئی شاخوں میں تقسیم ہو کر خود فنا ہو جاتی ہے ۔ مفروضہ قدیم ہندیورپی زبان کا حشر یہی تو ہوا کہ وہ بدلتے بدلتے ایک دن بہت سی زبانوں میں بٹ گئی اور خود چل بسی ۔ اس کی یہ شاخیں یا اولادیں، جو کچھ کہئے آج کل ہمارے سامنے موجود ہیں ۔

اس سلسلے میں ایک ماہر لسانیات جیکب گرم نے بڑا کام کیا اور صوتی تبدیلیوں کے

۱ ۔ لینگویج ص ۱۸۳ ۔ ۲ ۔ لینگویج ص ۲۷۳ ۔ ۳ ۔ لینگویج ص ۔ ۴ ۔ لسانیات ص ۔

کچھ اصول دریافت کیے جنھیں اس کے ساتھیوں نے "گرم کے قوانین" کا نام دے دیا مثلاً یہ کہ ان زبانوں میں سے ایک زبان کے لفظ کی گ دوسری زبان میں ک۔ ایک کی ب دوسری زبان میں پ اور ایک کی آواز د دوسری زبان میں ت ہو گئی ہے یعنی گ، ب، د کی آوازیں بالترتیب ک، پ، ت سے بدل گئی ہیں۔ گرم کی اس تحقیق کے بعد بھی کچھ ایسے الفاظ رہ گئے جن کی صوتی تبدیلی کی ان قوانین سے تشریح نہیں ہو سکی تو پھر ورنر نامی ایک اور محقق نے دوسرے قوانین دریافت کر کے پیش کیے اور جب کچھ دنوں کی وہ بھی تشریح نہیں کر سکا تو کوئی اور محقق اٹھا اور پھر اس نے اپنی بساط بھر ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی۔

اس صوتی تبدیلی کی ماہیت اور نوعیت وغیرہ سے تو میں آگے بحث کروں گا یہاں مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ زبان کی تبدیلی کا جو نظریہ ان صوتی تبدیلیوں کو دیکھ کر قائم کیا گیا تھا اس کے استحکام کے لئے محض صوتی تبدیلیوں کو ناکافی سمجھا گیا اور کوشش کی گئی کہ اپنے دعوے کو پکا کرنے کے لئے کچھ اور چیزیں بھی شامل کر لی جائیں چنانچہ آواز سے بڑھ کر لفظ اور معنی کی امداد بھی حاصل کر لی گئی اور ان کی تبدیلیوں پر بھی زور شور سے بحث جاری ہو گئی۔ اس کے متعلق جان لیونز لکھتا ہے:

"الفاظ وقت گزرنے کے ساتھ اپنے معنی ہی نہیں بدلتے بلکہ مختلف وجوہ سے خود بھی استعمال سے نکل جاتے ہیں اور دوسرے الفاظ ان کی جگہ لے لیتے ہیں[1]۔"

ایف آر پامر کہتا ہے "الفاظ حیرت انگیز طریقوں سے اپنی معنی تبدیل کر لیتے ہیں[2]"۔

بات ابھی ختم نہیں ہوتی۔ جیسپرسن نے ایک آخری قدم اٹھایا اور زبان کا گرامری ڈھانچا بھی اس سے ملا دیا۔ وہ کہتا ہے "ڈھانچے کی تبدیلی بھی زبانوں میں عام ہے[3]"۔

اور اب بات پوری ہو گئی۔ دعویٰ ہر طرح سے مکمل ہو گیا۔ تبدیلی کا مفروضہ چاروں چولوں سے درست بیٹھ گیا۔ اس میں آواز، لفظ، معنی اور صرف و نحو سبھی کچھ آ گیا۔

سب سے پہلے صوتی تبدیلی کی بات لیجئے۔ ان ماہرین نے صوتی تبدیلیوں کے اسباب کا سراغ لگانے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ نسل، آب و ہوا، طبعی حالات، غذا، پیشہ، طرز زندگی وغیرہ میں سے کوئی بھی عنصر ان صوتی تبدیلیوں کی تسلی بخش تشریح نہیں کر سکا جو ایک خاص وقت اور مقام پر تو رونما ہوتی ہیں لیکن دوسرے وقت اور مقام پر نظر نہیں آتیں۔

۱۔ لینگویج اینڈ لنگوئسٹکس ص ۲۰۹ ۲۔ سیمانٹکس ص ۱۰ ۳۔ ماڈرن انگلش ص ۲

ایک یہ نظریہ بھی قائم کیا گیا کہ زبان سیکھنے میں بچوں سے جو غلطیاں ہوتی ہیں ان سے صوتی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ صوتی تبدیلیاں کہیں زیادہ ہوتی ہیں اور ان کی قسمیں بھی بہت سی ہیں[1]۔

اس سلسلے میں کیلا کس کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے[2]۔

الف۔ "صوتی تبدیلی کے بارے میں کلارک گی کے نظریات کے مطابق جب کچھ خارجی اسباب سے تلفظ میں رد و بدل ہوا یعنی جب بہت سے بولنے والوں نے تلفظ میں کمزوری دکھائی یا وہ کسی آواز کو بالکل ہی چھوڑ بیٹھے تو صوتی تبدیلی پیدا ہو گئی جسے بعد میں گرامر میں شامل کر لیا گیا۔ جیسے بعض انگریزی الفاظ کے خاموش اسر جو لکھے تو جاتے ہیں پر بولے نہیں جاتے"۔

لیکن یہ مضحکہ انگیز بات ہے کیونکہ جرائم خواہ کتنے ہی بڑھ جائیں جن قوانین کو توڑتے ہیں انھیں تبدیل نہیں کر سکتے تو پھر غیر لسانی حالات سے پیدا ہونے والی غلط کاریاں زبان کے نظام میں کیسے تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔

ب۔ "اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بولنے میں زیادہ آسانی پیدا کرنے کی خاطر صوتی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ مثلاً مغربی زبانوں کے الفاظ میں اسروں کے جو جھٹ بنتے ہیں ان میں سے باہر کی طرف کا یعنی لفظ کا ابتدائی یا بالکل آخری اسر گرا دیا"۔

لیکن یہ حادثے اس کثرت سے پیش آتے ہیں کہ انھیں محض اتفاق کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا پھر ایسے واقعات بھی کسی ایسے اسر کے اندراج سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ صوتی تبدیلی کی ایسی مثالیں بہت زیادہ ہیں جن کی تشریح اس طرح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے بولنے کی سہولت اور آسانی کو صوتی تبدیلی کا سبب نہیں مانا جا سکتا۔

اس کمزور سبب کی اس قدر زوردار تردید کے باوجود ہمارے یہاں اس صوتی تبدیلی پر آج تک اسی طرح زور دیا جا رہا ہے جس طرح مغرب کی ایجاد کی ہوئی بعض دواؤں کا استعمال اپنے مضر اثرات کے باعث مغربی ممالک میں تو کبھی کا بند ہو چکا ہے لیکن ہمارے یہاں ابھی تک اسی زور شور سے جاری ہے۔ مثلاً ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

۱۔ "دل" سنسکرت لفظ "اخلات" سے "الام" سے ڈھالا گیا ہے اور جیسا کہ جان بیمز نے لکھا ہے "ن" کو جلدی بولنے کی وجہ سے "ا" کو "ہ" کی شکل دے دی گئی[3]۔

۱۔ علم اللسان انگریزی ص ۲۰۸ ۲۔ ایضاً ص ۲۰۶-۲۰۸ ۳۔ قواعد اردو ص ۵۱

۲۔ حالت محرف کی "ے" سنسکرت حرفی لاحقہ "ے سین" سے درج ذیل تبدیلیوں کے بعد وجود میں آئی، ے سین = ے سی = اِی = ے ہے۔

۳۔ "ہم" ویدک سنسکرت "اسمے" سے نکلا ہے۔ درمیانی مدارج یہ ہیں۔ اسمے = اَمہے = اَمہے = اَمھٗ = ہم۔

۴۔ سنسکرت اسم اشارہ "ے تت" سے "تت" گرنے کے بعد "اے" وجود میں آیا۔

۵۔ "اُن" ایک قرص صیغے "امیام" سے لیا گیا ہے۔

۶۔ "کون" مشرقی اپ بھرنش "کوَن" سے لیا گیا ہے یا "کیہ وُ" سے۔ چٹرجی سنسکرت "کَہ پُنہ" سے ماخوذ بتاتے ہیں۔

۷۔ "کچھ" کی اصل "کِنچت" بتائی گئی ہے۔

ج۔ بعض ماہرین نے یہ خیال پیش کیا کہ صوتی تبدیلی بے مقصد اور اوٹ پٹانگ رد و بدل کا نتیجہ ہے۔

لیکن ایسا ہوتا تو آوازوں کی تاریخ مختلف سمتوں میں بہتے ہوئے بچھڑے کی تاریخ ہوتی۔ پھر اس خیال کے پیش نظر یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ تمام آوازوں میں تبدیلی اس قدر باضابطہ اور باقاعدہ کیوں ہوتی ہے۔

صوتی تبدیلیوں کے اسباب کا سراغ لگانے میں مغرب کے ماہرین لسانیات کی ناکامی کا راز ان کی اس غلطی میں مضمر ہے کہ وہ زبان کے ایک صوتی اصول کو صوتی عادت سمجھ بیٹھے اور صوتی تبادل کو جو صرف مخصوص قدیم ہند یورپی زبان میں بلکہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے، صوتی تبدیلی کہہ اٹھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ لوگ ان صوتی تبدیلیوں کو صوتی قوانین کے مطابق باقاعدہ پاتے ہیں پھر بھی اپنی غلطی پر متنبہ نہیں ہو پاتے۔ مثلاً:

ایڈورڈ سپیر کہتا ہے۔ "صوتی تبدیلیاں باقاعدہ ہوتی ہیں"۔

ایڈگر اسٹرٹ ایوان کہتا ہے۔ "اسکالروں نے دریافت کیا ہے کہ اب تک جتنی زبانوں کا مطالعہ کیا جا چکا ہے ان سب میں صوتی قوانین اگر احتیاط سے بیان کئے جائیں تو نہایت باقاعدہ ہوتے ہیں"۔

۱۔ تحقیق اردو ص ۴۷ ۔ ۲۔ ایضاً ص ۷۱ ۔ ۳۔ ایضاً ص ۳۲ ۔ ۴۔ ایضاً ص ۴۷ ۔ ۵۔ ایضاً ص ۷۵ ۔ ۶۔ ایضاً ص ۷۵ ۔ ۷۔ ہیومن اوریجن ص ۲۰۲-۲۰۳ ۔ ۸۔ لینگویج ص ۱۶۰ ۔ ۹۔ انٹروڈکشن ٹو لنگوئسٹکس، ص ۱۲

جان لیونز کہتا ہے۔ "۱۸۷۰ء کے وسط میں نوگرامرین نے اعلان کیا تھا کہ ہم جو صوتی تبدیلیاں لسانی تاریخ کی تحریروں میں دیکھتے ہیں مقررہ قوانین کے مطابق ہوتی ہیں جو دوسرے قوانین کی مداخلت کے علاوہ کبھی نہیں بدلتے"۔

یہ صوتی تبادل جسے یہ لوگ صوتی تبدیلی کہتے ہیں صرف ایک زبان میں بھی مل جاتا ہے۔ چنانچہ فارسی زبان کی ہی چند مثالیں دیکھ لیجئے جسے ہند یورپی بلکہ آریائی خانوادے کی زبان کہا جاتا ہے۔

(ب پ) آب آپ، چسپیدن چسپیدن، تاب تاپ۔ (ت د) بارود باروت، زردشت زردشت۔ (ج چ) نرج نرچ۔ (ف پ) فارسی پارسی، پیروزی فیروزی، اسپند اسفند، سپید سفید۔ (ک گ) شکوہ شگوہ، شکفتن شگفتن، کلادن گلادن، کشودن گشودن۔ (ب د) نبرد نادرد، ابزار افزار، نابدان ناودان، نبشتن نوشتن۔ (ت ذ) آذربان آذربان۔ (چ ش) چلتوک شلتوک۔ (ج ژ) کج کژ۔ (د ل) جرنگ جلنگ۔ (خ ق) چخماق چقماق۔ (ق غ) مقناطیس مغناطیس، چغندر چقندر، تق تق چق چق۔ (خ ج) شلجم شلغم۔ (غ گ) زنجاب زنگاب۔ (ق گ) زرقون زرگوں۔ (س ہ) آماس آماہ، ماس ماہ، ریواس ریواہ۔ (ش خ) افراشتن افراختن وغیرہ۔

مزید ثبوت کے لئے فارسی زبان کا لغت فرہنگ جہانگیری دیکھئے جس میں لغت نگار انجو نے جیکب گرم سے کہیں زیادہ صوتی تبادل کی مثالیں دی ہیں۔ مغربی ماہرین لسانیات کے نزدیک تین تبادل یعنی ب اور پ، ت اور د، ک اور گ زیادہ اہم اور مشہور ہیں۔

صوتی تبادل آریائی اور ہند آریائی زبانوں یعنی ویدک، سنسکرت اور فارسی کے علاوہ خالص ہندی الاصل زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں اردو اور اس کی پڑوسی زبانیں برج بھاشا، اودھی، مراٹھی، راجستھانی، پنجابی، گجراتی اور سندھی وغیرہ شامل ہیں لیکن یہ بات خصوصیت کے ساتھ غور کرنے کے قابل ہے کہ آریائی زبانوں کے صوتی تبادل سے ان ہندی الاصل زبانوں کا صوتی تبادل قطعی مختلف ہے۔ جن مستشرقین نے دونوں گروہوں کا صوتی تبادل اس گمان پر ایک بتایا ہے کہ مندرجہ بالا خالص ہندی الاصل زبانیں بھی آریائی زبانیں ہیں انھوں نے سخت غلطی کی ہے اور اس برصغیر کے بھی جن محققوں نے ان کی دیکھا دیکھی ایسا خیال ظاہر کیا ہے اپنی سخت نادانی کا ثبوت دیا ہے۔

میں اردو اور اس کی پڑوسی زبانوں کا صوتی تبادل تفصیل کے ساتھ مناسب مقام پر

۱۔ انٹروڈکشن ٹو لنگوئسٹکس ص ۱۸

آگے پیش کروں گا۔ یہاں صرف آریائی اور ہندوستانی زبانوں کے صوتی تبادل کا ایک مختصر سا تقابلی نقشہ درج کرتا ہوں جس سے ایک طرف تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ صوتی تبادل زبانوں کی ایک مشترک اور عالمگیر خصوصیت ہے اور دوسری طرف یہ طلسم بھی ٹوٹ جائے گا کہ ہندی الاصل یا ہندوستانی زبانیں بھی آریائی اصل رکھتی ہیں۔ یہ نقشہ صرف انھیں تین آوازوں تک محدود ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

آریائی صوتی تبادل	ہندوستانی صوتی تبادل
ک = گ	ک = گھ
	گ = کھ
ت = د	ت = دھ
	د = تھ
پ = ب	پ = بھ
	ب = پھ

اس نقشے سے ظاہر ہے کہ آریائی زبانوں میں مصمت اور غیر مصمت آوازوں کا تبادل ہوتا ہے لیکن ہندوستانی زبانوں میں ہلکی (الپ پران) اور بھاری (مہاپران) آوازوں کا تبادل ملتا ہے اور بھاری آوازیں آریائی زبانوں میں سرے سے نہیں ملتیں۔

اب الفاظ کی بات آتی ہے تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ ہر شخص اپنی مادری زبان کے پورے ذخیرۂ الفاظ کا علم نہیں رکھتا۔ وہ اس کے محض ایک جزو سے ہی واقف ہوتا ہے۔ پھر گفتگو میں وہ اس جزو سے بھی کم الفاظ استعمال کرتا ہے یعنی وہ جتنے الفاظ کو جانتا پہچانتا ہے ان میں سے کچھ کو منتخب کر کے کام میں لاتا ہے۔ باقی اس کے حافظے میں بیکار پڑے رہتے ہیں۔ یوں زبانوں کے پورے ذخیرے کا بہت تھوڑا سا جزو یومیہ گفتگو یا تحریر میں استعمال ہوتا ہے۔ مستقل بول چال میں اس طرح کام آنے والا ذخیرہ بھی جسے چالو ذخیرہ کہا جا سکتا ہے کبھی ایک وقت میں صرف نہیں ہوتا بلکہ یوں ہوتا ہے کہ ایک وقت اس ذخیرے میں سے کچھ الفاظ چن کر بول لئے تو دوسرے موقعے پر کچھ دوسرے الفاظ استعمال کر لئے اور باقی حافظے میں محفوظ رہے۔ یعنی بولنے والا موقع محل، مخاطب اور موضوع گفتگو کے لحاظ سے الفاظ منتخب کر کر کے بولتا ہے اس لئے اس کی باتیں سن کر ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ زبان کے جو الفاظ اس کے استعمال میں نہیں آتے ہیں وہ چلن سے نکل گئے ہیں۔

ایک صورت حال یہ ہوتی ہے کہ دو افراد کا ذخیرۂ الفاظ بالکل ایک سا نہیں ہوتا یعنی ایک کے ذخیرے میں کچھ الفاظ مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو دوسرے شخص کی گفتگو میں نہیں آتے۔ پھر طبقاتی لحاظ سے بھی مختلف طبقوں کے افراد کا ذخیرۂ الفاظ مختلف ہوتا ہے۔ مقامات اور علاقوں کے فرق سے بھی مستعمل ذخیرۂ الفاظ میں فرق آ جاتا ہے۔

یہ بول چال کی کیفیت ہے۔ جب ہم تحریری زبان کی طرف دیکھتے ہیں تو اس میں تقریر کی طرح الفاظ کا آزادانہ استعمال نہیں پاتے۔ کتابوں سے بول چال کی وسعت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر ادیبوں اور شاعروں کے یہاں ترک و اختیار پر عمل ہوتا ہے۔ زبان بندھی ٹکی ہوتی ہے۔ گنے چنے ہوتے ہیں۔ الفاظ گنے چنے ہوتے ہیں۔ ذخیرۂ الفاظ مخصوص ہوتا ہے اور وہی بار بار دہرایا جاتا ہے۔ بعض ادیبوں کو بعض لفظوں اور ترکیبوں کا مخصوص ذوق ہوتا ہے۔ بعض دوسرے الفاظ سے انھیں اجتناب ہوتا ہے۔ ایک ادیب ایک لفظ کو ٹکسال باہر قرار دے دیتا ہے لیکن دوسرا استعمال کرتا ہے۔ عوام الناس تو ان قدغنوں کی پروا ہی نہیں کرتے لیکن صحیح اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے ان کی گفتگو ہمیں کہاں دستیاب ہوتی ہیں۔ لوگ صرف کتابوں ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نتیجے نکالتے ہیں۔ فیصلے کرتے ہیں اور نظریات و مفروضات قائم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ الفاظ کے استعمال میں آنے اور چلن سے خارج ہو جانے والی بات ماہرین لسانیات کی نہیں ادیبوں کی معلوم ہوتی ہے اور انھیں کو کہنی ہے۔

معنی کی تبدیلی دراصل کثرت معنی کی بات ہے۔ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں لیکن بیک وقت سبھی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ ہر معنی سیاق و سباق سے مخصوص ہوتا ہے۔ ایک مقام پر لفظ کے ایک معنی مراد ہوتے ہیں تو دوسرے مقام پر دوسرے۔ ایک ہی لفظ ہر نئے استعمال پر نیا لفظ ہوتا ہے۔ یہ معنی کی تبدیلی نہیں بلکہ مختلف معانی کا استعمال کہلائے گا یا نئے معنی کی ایجاد کہلائے گی۔ تو بلوم فیلڈ اپنی کتاب میں یہی کہتا ہے کہ "کسی لفظ کے معنی میں تبدیلی اس کے استعمال میں تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے[1]"۔ کثیر المعنی الفاظ بلااستثنا دنیا کی تمام زبانوں میں ملتے ہیں۔ یہ اس انسانی ذہن کی پیداوار اور اس انسانی تخیل کی دین ہے جو دنیا کے ہر خطے میں یکساں طور پر کام کر رہا ہے۔ چنانچہ کثرت معنی زبان کی ایک عالمگیر خصوصیت ہے۔ اسے ہم زبان کی تبدیلی کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتے۔

[1] لینگویج ص ۴۲۶

معنی کی دو خاص اور بڑی قسمیں ہیں ایک حقیقی یا لغوی اور دوسری مجازی۔ حقیقی معنی تو ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی رہتے ہیں اور مجازی معنی متکلم، مخاطب اور موقع محل کے لحاظ سے مختلف ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن اسے معنی کی تبدیلی نہیں کہہ سکتے۔ دوسرے معنی مراد لینے اور معنی کے تبدیل ہوجانے میں بڑا فرق ہے۔ معنی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی صرف ایک معنی کی جگہ دوسرے معنی مراد لے لئے جاتے ہیں اور یہ حقیقت معنی کی کثرت اور زبان کی وسعت کی دلیل ہے۔

زبان میں ایجاد و اختراع برابر جاری رہتا ہے۔ اصول موجود ہیں۔ بنیادیں رکھی ہوئی ہیں۔ ان پر تعمیریں ہوتی رہتی ہیں۔ جڑیں زمین میں پیوست ہیں۔ اب اگر درخت نئی نئی شاخیں نکالتا ہے اور برگ و بار لاتا ہے تو اسے درخت کی تبدیلی نہیں کہہ سکتے۔ بنیادوں پر عمارت کھڑی کرنے کو تبدیلی نہیں کہتے۔ زبان کے مادوں اور اصولوں سے نئے نئے روپ ڈھلتے اور ایجاد ہوتے کو تبدیلی نہیں کہتے اضافہ کہتے ہیں۔ اگر کچھ آوازیں ختم ہو جائیں اور کچھ دوسری ان کی جگہ لے لیں تو اس عمل کو آوازوں کی تبدیلی کہیں گے۔ اگر کچھ لفظ چلن سے نکل جائیں اور کچھ دوسرے ان کی جگہ نئے بنالئے جائیں یا کہیں سے ادھار لے لئے جائیں تو یہ لفظوں کی تبدیلی کہلائے گی۔ اگر کچھ معنی متروک یا بیکار ہو جائیں اور کبھی مراد نہ لئے جائیں بلکہ ان کی جگہ دوسرے معنی استعمال ہونے لگیں تو اسے معنی کی تبدیلی کہیں گے۔ اسی طرح اگر زبان کا ایک ڈھانچا غیر مستعمل ہو جائے اور دوسرا استعمال میں آجائے تو یہ ڈھانچے کی تبدیلی ہوگی۔ مراد یہ ہے کہ جب ان اجزا میں سے کسی ایک جزو کی جگہ دوسرے جزو کا چلن ہو جائے اور پہلا فرسودہ، ناکارہ یا ناقابل عمل اور غیر مستعمل ہو جائے تو اسے اجزا کی تبدیلی کہیں گے اور اگر تمام اجزا اسی طرح تبدیل ہو جائیں یعنی ایک کا ایک سیٹ بیکار اور غیر مستعمل ہو کر طاق نسیاں کی زینت بنتا جائے یا ایک طرف پھینکتا رہے اور دوسرا اس کی جگہ لیتا رہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ زبان تبدیل ہو گئی ہے، تبدیل ہو رہی ہے یا تبدیل ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہے۔

زبان میں ایجاد و اختراع کی بدولت اس کے تمام اجزا اپنی اپنی جگہ بڑھتے رہتے ہیں۔ پہلے روپ بھی موجود رہتے ہیں اور ان کے پہلو بہ پہلو نئے روپ بھی بن بن کر ان میں ملتے رہتے ہیں۔ اس سے ان اجزا میں اضافہ ہوتا ہے۔ لفظوں میں اضافہ ہوتا ہے، معنی میں اضافہ ہوتا ہے، زبان میں اضافہ ہوتا ہے اور اضافے کی تبدیلی نہیں کہتے اور اگر اسے تبدیلی کہتے ہیں تو پھر اضافہ کسے کہتے ہیں؟ زبان ہمیشہ سے اتنی ہی وسیع و ہمہ گیر نہیں تھی جتنی اس وقت ہمارے سامنے موجود

ہے۔ یہ تھوڑی سے بہت، چھوٹی سے بڑی اور کمزور سے توانا ہوئی ہے۔ اس میں اضافہ ہوا ہے تبدیلی نہیں آئی ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ پہلے کچھ اور بولتے تھے اور اب کچھ اور بولنے لگے جیسا کہ مغرب کے ماہرین لسانیات نے ناٹک رچایا ہے۔ زبان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے تبدیلی نہیں آتی۔ وہ کبھی تبدیل نہیں ہوتی کیونکہ تبدیل ہو نہیں سکتی۔ نوع انسانی آپ اپنی محنت پر پانی نہیں پھیر سکتی اور اسے خود اپنے ہاتھوں ضائع کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔

لسانیات کے مغربی ماہروں کو زبان کی تبدیلی کا جو دھوکا ہوا ہے اس کا ایک خاص سبب لپی سے پیدا ہونے والی مشکلات ہیں اور یہ خاصی اہم ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے تاریخی لسانیات قدیم تحریروں کو پڑھ کر ہی مختلف زبانوں کا موازنہ کرتی ہے۔ اس سلسلے میں لپیوں نے جو دقتیں پیدا کر دی ہیں، جو الجھنیں کھڑی کی ہیں اور جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کے بیانات سے خود انھیں ماہروں کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

زبانوں کی تبدیلی کے ثبوت میں بلوم فیلڈ قدیم تحریروں کا حوالہ دیتا ہے اور کہتا ہے مثلاً جیمس کی انجیل اور شیکسپیئر کی انگریزی آج کی انگریزی سے مختلف ہے۔ چاسر کی چودھویں صدی کی انگریزی ہم صرف لغت کی مدد سے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ شاہ الفرڈ اعظم کی نویں صدی کی انگریزی جس کے معاصر مخطوطے ہمارے پاس موجود ہیں، ہمیں اجنبی زبان ہی لگتی ہے۔ اگر اس زمانے کے انگریزی بولنے والوں سے ہماری ملاقات ممکن ہوتی تو نہ ہم ان کی گفتگو کچھ پاتے نہ وہ ہماری[1]۔ چنانچہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ زبان برابر بدل رہی ہے اور جیسے جیسے ہم ماضی کی طرف بڑھتے جاتے ہیں ہمارے لئے زبان کا سمجھنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔ چارلس الف ہاکٹ نے بھی ۱۳۹۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کی انگریزی کے نمونے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں[2]۔

اس کے باوجود بلوم فیلڈ کو لپی کے نقائص کا خود ہی احساس ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ تحریریں ہمارے سامنے ماضی کی بول چال کی بیشتر بگڑی ہوئی تصویریں پیش کرتی ہیں جن کے پڑھنے اور سمجھنے میں کافی عرق ریزی کرنا پڑتی ہے۔ سب سے پہلے تو تحریری علامات کی اصلیت ہی معلوم نہیں ہوتی۔ قدیم تحریروں میں حروف کی صحیح صحیح صوتی قیمت تو کبھی خود پڑھنے والا ہی جان ہی نہیں سکتے۔ قدیم یونانی، لاطینی، گاتھک یا قدیم انگریزی جیسی زبانوں کے حروف کبھی کبھی جن آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں سے کچھ غیر یقینی ہیں۔

۱۔ بلوم فیلڈ ص [illegible]   ۲۔ کورس ان ماڈرن لنگوئسٹکس ص [illegible]

پھر کاتبوں اور نقل نویسوں نے بھی نقل کرتے میں گل کھلائے ہیں۔ جہاں کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آیا وہاں اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ کہیں اپنا لفظ رکھ دیا اور کبھی کبھی اپنے علم کی حد تک زبان کی بھی اصلاح کر دی۔ کبھی پرانی تحریروں کا متن نئے حروف تہجی یا نئی رسم کتابت میں سے اس طرح گذرا ہے کہ اس کے معنے ہی بدل گئے ہیں۔ قدیم یونانی کے مشہور شاعر ہومر کی نظموں اور اوستا کے متن کے ساتھ کچھ ایسا ہی حادثہ پیش آیا ہے[1]۔

قدیم تحریروں میں حرف اور آواز کے صحیح تعلق کا پتا لگانا نہایت ضروری ہے۔ الفاظ کا ابتدائی اور صحیح تلفظ اسی طرح ہاتھ آسکتا ہے اور تبھی ہم ان متون کا صحیح مفہوم بھی سمجھ سکتے ہیں۔ تحریروں کے مطالعے میں یہی کا قدم درمیان میں آجاتا ہے اور یہاں سو فیصدی معتبر نہیں ہوتیں۔ معتبر یہی وہی ہو سکتی ہے جس کا ایک ایک حرف ہر مقام پر صرف ایک ایک آواز ہی کی نمائندگی کرتا ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ مختلف علاقوں میں ایک ایک آواز کو کئی کئی حروف سے قلم بند کیا گیا ہے اور کئی کئی آوازوں کے لئے ایک ہی علامت استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً ہم انگریزی زبان کی جو کتابیں اپنے یہاں پڑھتے ہیں ان میں حرف سی (C) سے س یا کاف کی آواز مراد ہوتی ہے لیکن دوسرے ملکوں میں یہ ز، ج اور خ کی آواز کی بھی نمائندگی کرتا ہے جیسے عربی جمل انگریزی کیمل (Camel) یا فارسی جادو، ترکی سادت (Caat) یا یونانی سرکس (Circus)، فارسی چہرہ۔ جی (G) کو ادھر سے یہاں گ کا جیسے گولڈن (Golden)، مصر میں ج کا جیسے جمل (Gamel) اور لاطینی میں ز کا جیسے سفری اور (Ego) نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح ویدک اور سنسکرت میں ہائے ہوز سے ز کی آواز مراد لی جاتی ہے جیسے سنسکرت اہم = اوستا ازم (میں)، سنسکرت ہست = اوستا زست (ہاتھ)، سنسکرت سسر = فارسی ہزار، ویدک ہرید = فارسی زرین، ویدک ک = فارسی را جیسے ویدک کریم = فارسی خرامیم (ہم چلیں)، ویدک کرتو = فارسی خرد (عقل)، ویدک گھ = فارسی غ جیسے ویدک دروگھ = فارسی دروغ (جھوٹ)، ویدک اور سنسکرت س = اوستا اور فارسی ہ اور خ جیسے ویدک سوین = اوستا ہون اور ہوئن (سونا)، ویدک سومر = فارسی تاہبر وغیرہ۔

ہندوستانی لسانیات کے محققین نے بھی از منہ قدیم سے آج تک ویدک اور سنسکرت کے کتابی روپوں ہی کو پیش نظر رکھا اور ان کے حروف سے وہی آوازیں مراد لیں جو آج اس

---

[1] علم اللسان، لنگوئج، ص ۲۰۲ء

علاقے میں علی العموم مقصود ہوتی ہیں یعنی انھوں نے ان کے حقیقی تلفظ سے غفلت برتی۔ آواز اور حرف کے اصلی تلفظ پر توجہ مرکوز نہیں کی اور کتابی روپ کو ملفوظی روپ میں نہیں ڈھالا اور جب اسے سمجھنے سے قاصر رہ گئے تو کہہ دیا کہ ویدک اور سنسکرت قدیم زبانیں ہیں یعنی ان کے بولنے کا چلن دنیا سے جاتا رہا ہے۔

یہی وجہ تھی جو ویدک زبان کے ماہر اسے میکڈانل نے اپنی کتاب ویدک پرائمر[1] میں رگ وید کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان کے بعض بعض سوکتوں میں عروضی بحروں کی خامیاں نکالی ہیں اور بعض ارکان کی کمی بیشی بتائی ہے لیکن میں ان مقامات کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ان الفاظ کا صحیح تلفظ دریافت کر لیا جائے تو پھر ان بحروں میں ارکان کی کوئی کمی بیشی باقی نہیں رہتی۔ میرے نزدیک صحیح ملفوظی روپ کی جانچ یہ ہے کہ اس سے بحر بالکل درست ہو جاتی ہے اور اس کے معنی بھی اپنے سیاق و سباق میں ٹھیک بیٹھ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں دوسری دقت رسم کتابت کی ہے جو دو کتابوں میں بدل جاتی ہے جیسے میں نے اردو ہی کے ایک لفظ کو مختلف نئی پرانی تحریروں میں پانچ طرح پہونچ، پہنچ، پھونچ، پونچ اور پہنچ لکھا دیکھا ہے حالانکہ ہر مقام پر اس کا ایک ہی ملفوظی روپ سننے میں آتا ہے۔ اس لئے قدیم تحریریں پڑھتے وقت سخت احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے اور پاکٹ کے یہاں مجھے اسی احتیاط کا فقدان نظر آتا ہے کیونکہ اس نے اپنی کتاب[2] میں قدیم تحریروں کے جو نمونے درج کئے ہیں ان کے دیکھنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ رومن لپی کے نقص کے ساتھ ساتھ جیسے ان تحریروں میں املا کے کوئی اصول ہی مقرر نہیں ہیں۔ ایک ہی لفظ کو ہر لکھنے والا اور کہیں کہیں تو ایک ہی لکھنے والا مختلف شکلوں میں لکھ رہا ہے۔ یوں ان نمونوں میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی روپ نظر آتے ہیں لیکن انگریزی زبان وہی ہے البتہ کہیں کہیں کوئی ایک آدھ لفظ ایسا بھی آگیا ہے جو نامانوس سا لگتا ہے لیکن ہے وہ بھی اسی زبان کا۔

غرض قدیم تحریروں کے مطالعے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے حروف کی آوازیں متعین کر لی جائیں پھر جب مزید مثالوں سے ان کی تصدیق اور توثیق ہو جائے تو بھرپور طریقے سے ان کی تشریح و تفسیر بیان کی جائے۔ اس طریقہ کار سے میرے نزدیک کوئی قدیم زبان قدیم نہیں رہے گی یعنی ایسی زبان نہیں ہوگی جو اب بولی نہیں جاتی بلکہ زندہ اور پائندہ نظر آنے لگی گی۔

---

[1] مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن

[2] اے ریڈر ان مڈل انگلش

۲۔ زبان کی مکانی حقیقت:

یہاں تک میں نے تاریخی لسانیات کے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ زبانیں مرورِ ایام کے ساتھ بدل جاتی ہیں اور اس کے لئے صوتی، معنوی اور گرامری تبدیلی سے متعلق غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ غلط فہمیاں جن اسباب سے پیدا ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہی ہے جس پر میں تفصیل سے بات کر چکا ہوں۔ دوسرا اور بہت بڑا سبب زبان کی رنگارنگی اور بوقلمونی ہے جس پر میں اگلے صفحات میں اظہارِ خیال کروں گا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پوری انیسویں صدی عیسوی میں لسانیات کے مطالعے پر تاریخیت چھائی رہی اور کسی زبان کے تشریحی مطالعے کو اس تاریخیت سے ہٹ کر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ان تاریخی لسانیات کا نظریہ یہ تھا کہ تمام زبانیں کسی ایک ہی قدیم زبان سے نکلی ہیں اسی لئے ان میں کچھ مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ ان مشابہتوں کی بنیاد پر انھیں مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح ممکن ہے کہ آگے چل کر ان خاندانوں کی مشترک مشابہتوں کی بنیاد پر تاریخی لسانیات کسی ایک قدیم ترین زبان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے جو دنیا بھر کی تمام زبانوں کی مورثِ اعلیٰ قرار پائے لیکن لوگ ایسی کسی زبان کا سراغ نہیں لگا پائے اور بند گلی میں پھنس کر رہ گئے۔ اسی لئے لسانیات کی تحقیق میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی اور لوگوں میں ایک طرح کی بددلی اور بیزاری سی پیدا ہو گئی۔

فرڈی نینڈ ڈی ساسیر پہلا ماہر لسانیات ہے جس نے اپنی کتاب "کورس ان جنرل لنگوئسٹکس" میں زبان کے مطالعے کو مندرجہ ذیل دو قسموں میں بانٹ کر ان دونوں خیالات کو الگ الگ کیا۔

۱۔ ہم وقتی: کسی ایک مقام پر کسی ایک دور میں زبان کی حالت کا مطالعہ جسے تشریحی لسانیات کا نام دیا گیا ہے۔

۲۔ بعد وقتی: کسی ایک مقام پر زبان کی دور بہ دور حالتوں کا مطالعہ جسے تاریخی لسانیات کا نام دیا گیا ہے۔

سا سیر کی یہ بات قابلِ قدر ہے کہ اس نے تشریحی لسانیات کو تاریخی لسانیات کی غلامی سے آزاد کرا کے پہلی بار اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی لیکن ابھی اس کا جائز اور واجب منصب دلانے کے لئے کسی بھی دانش کے بغیر دو ٹوک الفاظ میں یہ اعلان کر دینا بھی ضروری اور باقی ہے کہ تاریخی لسانیات نہ صرف الٹی اس کی پابند اور محتاج ہے بلکہ خود اپنی جگہ ایک بے کار مشغلہ اور

گمراہ کن مفروضہ بھی ہے جس نے لسانیات کے مطالعے کو ایک غلط راستے پر ڈال کر اس کی تحقیق اور فروغ میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔

ذرا سا غور کرنے پر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مطالعۂ زبان کے متعلق ماہرین کا نظریہ اب تک ٹیڑھا رہا ہے۔ تشریح اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب تک کسی ایک مقام پر رک کر زبان کی کسی ایک دور کی حالت کا مطالعہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اس کی دور بہ دور حالتوں کا موازنہ کیسے ہو سکے گا اور اس کی تاریخ کیسے مرتب کی جا سکے گی۔ خط مستقیم مختلف نقاط کے تسلسل کو کہتے ہیں اور تاریخ مختلف ادوار کے تسلسل کا دوسرا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم وقتی مطالعہ جسے تشریحی لسانیات کہتے ہیں بعد وقتی مطالعے یعنی تاریخی لسانیات کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس تاریخی لسانیات تشریحی لسانیات کی مدد کی محتاج ہے۔

پھر اسے اس پہلو سے بھی دیکھئے کہ کائنات میں زمان کی تشریح مکان کے حوالے ہی کی جا سکتی ہے کیونکہ زمان مکان کی ہی ایک مجرد شکل ہے۔ وقت کی اکائیاں بنیادی طور پر مکانی ہیں۔ زمان کی پیمائش کے طریقوں کی اساس بھی مکان پر ہے۔ فوقانی تصور تحتانی تصور کا محتاج ہے اور تاریخ جغرافیائی سرحدوں سے ہی اپنے طویل سفر کا آغاز کرتی ہے۔ زبان کی تاریخ جاننے کے لئے اور جاننے سے پہلے اس کی دور بہ دور حالتوں کا علم ناگزیر ہے یعنی لسانی مطالعے میں بنیادی بلکہ واحد اہمیت مکانی لسانیات کو حاصل ہے اور مکانی لسانیات کو زمانی لسانیات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اب اس حقیقت کو ایک اور زاویے سے دیکھئے۔ تاریخ ہمیں زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال قبل مسیح تک لے جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے کے کوئی آثار ہم تک نہیں پہنچے۔ تاریخی لسانیات والے یہ نہیں بتلاتے کہ انھوں نے لسانی تحقیق کی غرض سے اس مدت کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کی مدت کتنی رکھی ہے؟ کیا ایک ایک ہزار سال کا ایک ایک دور مقرر کیا جا سکتا ہے؟ کیا ایسی تحریریں دستیاب ہیں کہ انھیں آٹھ ادوار (چھ ہزار قبل مسیح + دو ہزار بعد مسیح) میں تقسیم کر دیا جائے یا پانچ پانچ سو سال کا ایک ایک دور ٹھہرا کر اس پورے عرصے کو سولہ ادوار میں بانٹ دیا جائے اور زبان کے سولہ نمونے تقابلی مطالعے کے لئے سامنے رکھ لئے جائیں؟ مجھے یقین ہے کہ ان کے پاس اتنے تحریری نمونے اس یکساں حد بندی کی شرط کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔

دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ کس تحریر کو اپنے دور کی نمائندگی کا حق حاصل ہے؟ تاریخی

لسانیات کے ماہرین کے پاس وہ کون سا معیار ہے جس کی رو سے وہ یہ طے کر سکتے ہیں کہ فلاں زمانے کی اتنی تحریروں میں سے صرف فلاں تحریر اس دور کی نمائندہ ہے اور اس کے علاوہ دوسری کوئی تحریر نمائندگی کی اہلیت نہیں رکھتی؟ یا کسی نمونے کی دستیابی ہی کو اس کی نمائندگی کا معیار بنا لیا گیا ہے؟ غالباً بات کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانے کی جو تحریر مل گئی ہے وہی اس دور کی نمائندہ تحریر مان لی گئی ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک ہی زمانے میں ایک شاعر شعر کہتا ہے اور دوسرا شخص جغرافیے کی کتاب لکھتا ہے تو دونوں میں سے کس کی تحریر اس زمانے کی زبان کی نمائندہ مانی جائے گی؟ اردو کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی زبان کو انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کی نمائندہ زبان مانیں گے یا اس جغرافیے کی کتاب کی زبان کو نمائندگی کا حق دیں گے جو اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔

اگر ایک ہی شخص کی دو تحریریں سامنے آجاتی ہیں، ایک اس کی شاعری اور دوسری اس کی نثر اور دونوں میں زبان کے اعتبار سے فرق ہے تو اس کی کون سی تحریر اس کے دور کی نمائندگی کرے گی؟ اگر اس کی شاعری میں بھی دو قسم کی زبان استعمال ہوئی ہے تو اس شاعری کا کون سا جزو اس دور کی زبان کا نمائندہ ہوگا؟ مثلاً مرزا غالب دہلوی کے خطوط کی زبان ان کے اشعار کی زبان سے مختلف ہے اور پھر خود اشعار بھی دو قسم کی مشکل اور آسان زبان میں کہے گئے ہیں تو ان کی زبان کا کون سا نمونہ اور کون سا جزو نمائندہ مانا جائے گا؟

آج سے گیارہ سال پہلے میں نے ۱۹۶۸ء میں تشریحی یعنی مکانی لسانیات پر "اردو کا روپ" نامی ایک کتاب لکھی تھی جس میں زیادہ سے زیادہ کھری اور بے میل اردو لکھنے کی حتی المقدور کوشش کی تھی تاکہ اردو کو حقیر اور بے مایہ سمجھنے والوں کو یہ دکھا سکوں کہ اردو خود اپنے پیروں پر اور اپنی ہی سکت سے کھڑی ہوتی ہے اور اس میں فنی اور علمی موضوعات پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کی زبان میری موجودہ تحریر کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اگر مستقبل میں تاریخی لسانیات کے کسی ماہر کو صرف میری ہی دونوں تحریریں دستیاب ہو جاتی ہیں تو کیا وہ میری اردو کو پورے موجودہ دور کی زبان کی نمائندہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا؟ اور اگر وہ صرف ان کی دستیابی ہی کی بنیاد پر انھیں نمائندگی کا حق دے دیتا ہے تو اس دور کی زبان کے نمونے کے طور پر ان دونوں تحریروں میں سے کون سی تحریر پیش کرے گا؟ پھر اگر زبان مرورِ ایام سے ہی تبدیل ہوتی ہے تو

کیا وہ یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوگا کہ اردو زبان صرف تیرہ سال کے عرصے میں اس قدر بدل گئی ہے؟ اور اگر وہ یہ نہیں کہتا تو زبان کے فرق کی کیا توجیہ کرے گا؟

میر امن دہلوی کی کتاب "باغ و بہار" (سن تصنیف ۱۸۰۲ء) اور رجب علی سرور کی کتاب "فسانۂ عجائب" (سن تصنیف ۱۸۲۴ء) کی اردو میں جو فرق نظر آتا ہے اس کی وجہ بائیس سال کا بعد زمانی ہے یا دلی اور لکھنؤ کے درمیان کا مکانی فاصلہ؟ اعظم علی اعظم اکبر آبادی کی طرح ابتدا میں رجب علی بیگ سرور بھی آگرے کے باشندے تھے لیکن بعد میں لکھنؤ جا بسے تھے۔ ۱۸۲۴ء میں یعنی جس سال رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھا اعظم علی اعظم نے "قصہ سرور افزا" تحریر کیا لیکن دونوں کی اردو میں فرق ہے اور جب دونوں کی تحریروں میں زمانی فاصلہ نہیں ہے تو لکھنؤ اور آگرے کے مکانی فاصلے کے سوا فرق کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

یہ پچھلی صدی کی بات تھی اور ڈیڑھ سو سال پرانی بات تھی۔ اب میں آپ کے سامنے اسی صدی بلکہ اس کے بھی نصف آخر کی اردو بول چال کے تین نمونے پیش کرتا ہوں۔ یہ نمونے میں نے تقریباً تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکوں کی امتحانی کاپیوں سے جو اردو زبان زبانِ اول کی حیثیت سے پڑھ رہے تھے، ان کے نمائندہ اور چیدہ جملے لے کر ۱۹۷۰ء میں تیار کئے تھے۔ ان کے سلسلے میں میرا کام بطور مدیر صرف اتنا رہا ہے کہ میں نے مضمون مختصر کر دیا ہے لیکن جملوں کے انتخاب میں یہ دھیان رکھا ہے کہ ان کے خیالات کا تسلسل برقرار رہے اور مقامی بول چال کی زیادہ سے زیادہ خصوصیت سامنے آجائیں۔

۱۔ ڈھاکے کی اردو

ہم لوگ کا اسکول ساڑھے بارہ باجے ڈھکتا ہے اور ایک باجے چھٹی پڑتی ہے۔ سب سے بعد میں اپنے کلاس سے نکلتا ہوں۔ ہم جب اسکول سے آتے ہیں تو اس وقت ڈیڑھ بجتا ہے۔ اس وقت اتنا گرمی ہوتا ہے کہ سب کوئی اپنا ہوش و حواس اڑا دیتا ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد ہم گوسل کرتا ہوں۔ کپڑا بدل کر ناشتہ کرتے ہے۔ پھیر تھوڑا آرام کرتے ہے۔ ایک گھنٹہ مولوی صاحب سے پڑھتے ہے۔ تین باجے سے اسکول کا کام بناتا ہوں۔ پھر ہم دُوسرا کپڑا بدل کر اپنے دوستوں کے یہاں چلے جاتا ہوں۔ سب کوئی کو ساتھی کی ضرورت ہے۔ بغیر اس کے کوئی رہ نہیں سکتا۔ اس طرح لوگ کے کافی دوست ہو جاتے ہیں۔ میرے بھی بہت سے دوست ہیں۔ ان لوگ ہمارے

مکان کے پاس ہی رہتے ہیں۔ اس کا باپ بہت اچھے ہیں۔ میں کوئی دن کرکٹ کھیلتا ہوں۔ کوئی دن فٹ بال کھیلتا ہوں۔ دو تین گھنٹہ کھیل کرنے کے بعد گھر آتے۔ کپڑا بدل گیا۔ پھیر میں سائیکل پر بیٹھ کر نانی کے گھر چلے جاتا ہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے گھر کے طرف ہو لیا۔ گھر جاتے تک سات بج جاتے ہے۔ پہلے گوسل کرتے ہیں پھیر کھانا کھاتے ہیں۔ سردی میں گوسل کے لئے گھنٹہ پہلے سے پانی گرم کرنے پڑتا ہے۔ پھیر گوسل کر کے گرم کپڑا پہنے تو ٹھنڈا لگتا ہے۔ کھانا کھانے بعد میں رات کی سلسلاتی میں اپنا پڑھائی نکالتے ہیں اور پڑھنے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنی امتحان کا تیاری سروع کرتے ہیں۔ اگر کچھ سوجھ میں نہیں آتے تو اپنا بڑا بھائی سے سمجھ لیتے ہے۔ اس کے بعد کوئی کہانی کی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس طرح ساڑھے دوش بج جاتے ہیں۔ سوتا وقت امی ابا کو سلام کرتے ہے۔ پھر کلمہ پڑتا ہیں اور گیارہ بجے سو جاتا ہیں۔ دوسرا دن جب آنکھ کھلتی ہے تو پھیر آپنا کام سروع کرتا ہیں۔ سب کوئی گھر کے یہاں ٹھیک ہیں پر والد صاحب ہماری امتحان سے پریسان ہیں۔ وہ بچے لوگ کی امتحان کے بعد چٹگام جائیں گا۔

۸۔ پشاور کی اردو

جب ہمارا اسکول کا چھٹی کی گھنٹی بجی تو ہم اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ ساڑھے ایک بجے گھر کو پہنچیں گا۔ ماں باپ کا سلام کرتا ہوں۔ پھر کپڑے بدل کرتا ہوں۔ منہ ہاتھ دھوتا ہوں۔ جب روٹی کھاؤں تو تھوڑا دوپہر کا نیند کرتا ہوں۔ جب اٹھ جاتا ہوں تو وضو کر کے نماز کروں۔ نماز کے بعد ہم چلنے چلتا ہے۔ پھر فٹ بال کرنے جاوں۔ میرا فٹ بال کے ساتھ بہت شوق ہے۔ کبھی شاہی باغ جا کر پیچ باندھتے ہیں۔ پتنگیں لگاتے ہیں۔ نعرہ بناتے ہیں۔ لڑکے شام تک کھیلوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے بعد ذرا دھوپ کم ہو جاتا ہے۔ جب میں کھیلنے سے آجاؤں تو پھر بازار کو چکر لگاؤں گا۔ اس کے بعد قرآن شریف کا تلاوت کرتا ہوں۔ تلاوت کے بعد میں اپنے بہن کی گھر جاؤں۔ بہن کی خاوند بیوہ ہے۔ جب بہن کی گھر سے آجاؤں تو پڑھائی کرتا ہوں۔ باپ ہم کو پڑھائی میں بہت کوشش کرتے ہیں اور میں اس پر خوب سمجھتا ہوں۔ کچھ دیر بعد پر مجھ سے پوچھتا کہ میں نے آپ کیا کیا بنایا اور میں اس کو بتاتا ہوں۔ جب کسی چیز مجھے غلط ہو جائے تو مجھے غصہ ہوتے۔

پڑھائی کا کام ختم کرنے کے بعد پھر میں عشا کا نماز پڑھوں اور پھر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد میں اپنا دماغ کو تازہ کریں۔ پھر پڑھائی کا کام شروع کرتا ہے۔ پھر میں اپنا بستہ بند کروں اور پھر بڑے بھائی کے ساتھ مجھ سے لطیفے پیش کرتے ہیں۔ پھر سائیکل کا صفائی کرتا ہوں اور سو جاتا ہوں۔ اس لئے میں اس کام کو ہمیشہ اس طرح آباد رکھیں گے تو کامیاب ہوں گے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی اپنی کاموں کو وقت پر کریں۔

۹۔ قصور کی اردو

مجھے سکول سے تقریباً ایک بجے کے قریب چھٹی ہوتی ہے۔ سکول سے آنے کے بعد کیونکہ بہت تھکاوٹ ہوتی ہے لہذا بستہ رکھ کر ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاتا ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑا سو جاتا ہوں اور تین بجے تک سویا رہتا ہوں۔ اس وقت میں کھلا کرتا اور کھلی شلوار پہنتا ہوں۔ گرمی اتنی ہوتی ہے کہ اٹھنے کو دل نہیں کرتا۔ پھر اپنا کام جو دیا گیا ہوتا ہے وہ میں نے کرنا ہے۔ اس کے بعد نزدیکی نہر پر جا کر نہاتا ہوں۔ اس سے ایک تو ورزش ہو جاتی ہے دوسرا گرمی سے نجات مل جاتی ہے۔ پھر میرا دل کھیلنے کو کرتا ہوں تو میں کھیلنے چلا جاتا ہوں۔ میں بہت سی کھیلیں کھیلتا ہوں۔ مرضی آتے تو ہم انور کو مخالف ٹیم سے بچا بھی ڈالتے ہیں۔ آگے میرا دوست بلو ہوتا تھا۔ جب دیکھو اس نے کتاب ہاتھ میں پکڑی ہوتی ہے۔ وہ امتحان میں اچھے نمبر لیتا تھا۔ اب وہ دسویں کا ماہنیز لگا ہوا ہے۔ تین چار دنوں کے بعد میں اس کے پاس بھی چلا جاتا ہوں۔ جب گھر واپس لوٹا تو آگے شام کی چائے میز پر پڑی ہے اور صحن میں چھڑکاؤ ہوا ہے۔ پھر میں پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس وقت تک پسینہ سوکھ چکا ہوتا ہے۔ سکول کا کام کرنے کا میں نے ٹائم ٹیبل بنایا ہوا ہے۔ اکثر تو میں اپنا کام سکول میں ہی ختم کر کے آتا ہوں۔ گھر میں پھر کوئی بھی بوجھ نہیں رہتا ہے کیونکہ میں روزانہ کا کام روزانہ کرتا ہوں۔ اس وقت میں چھوٹے بھائی کو بھی پڑھنے کو کہتا ہوں۔ سکول کے کام کو ختم ہوتے ہوتے مغرب آجاتی ہے۔ جب سورج غروب ہوتا ہوا دکھائی دینے لگ جاتا ہے اور پرندے اپنے گھونسلوں کو جا رہے ہوتے ہیں تو تب بجلی کا بلب جلاتا ہوں اور ٹی وی دیکھنے لگ پڑتا ہوں کیونکہ میں نے کام کر لیا ہوتا ہے اور میرے دوست ٹی وی دیکھنے آتے ہوتے ہیں۔ ٹی وی ہم گرمیوں میں اس لئے کم دیکھتے ہیں کیونکہ راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ پھر ماسٹر صاحب نے جو مضمون یاد کرنے کو دیا ہوتا ہے وہ یاد کر لیتا ہوں۔ اگر کوئی سوال بھول جائے تو ابا جان سے وہ سوال پوچھ لیتا ہوں۔ رات کو

سوتے وقت میں اور میرے بہن بھائی آپس میں پہیلیاں بھی ڈالتے ہیں۔ اس طرح پہیلیاں ڈالتے ڈالتے کوئی دس بجے کے قریب چادر لے کر سو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی سونے کے پہلے میں ابا جان کو بھی دباتا ہوں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ زبان کبھی اور کہیں بھی ہموار اور یکساں نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ماہرین لسانیات کی چند آرا ملاحظہ فرمایئے۔

ایڈورڈ سپیر کہتا ہے: "ہر شخص جانتا ہے کہ زبان رنگ برنگی ہوتی ہے۔"[1]

اسٹیفن المین کہتا ہے: "عام زبان کبھی یکساں نہیں ہوتی .... ہم چاہے تین ہزار سال قبل مسیح کی بات کریں یا چاہے ۱۹۷۰ء کی، مکمل طور پر یک رنگ زبان ایک مغالطہ ہے۔"[2]

جان لیونز کہتا ہے: "کوئی زندہ زبان مکمل طور پر یکساں نہیں ہے۔"[3]

اگر آپ زبان کی مکانی وسعت اور رنگا رنگی کا اندازہ کرنا چاہیں تو کرۂ ارض کے محیط کے ساتھ ساتھ شرقاً غرباً یا شمالاً جنوباً سفر کرتے چلے جایئے، آپ کو یوں لگے گا جیسے یہ صفحۂ زمین نہیں ایک وسیع و بسیط خطۂ چمن ہے جس میں بھانت بھانت کی چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ انسان زمین کے مختلف خطوں اور علاقوں میں بسے ہوئے مختلف زبانیں بول رہے ہیں جن میں پڑوسی ایک دوسرے کی بول چال سمجھ لیتے ہیں لیکن جیسے جیسے ان علاقوں کا درمیانی فاصلہ زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے ان کے باسی ایک دوسرے کی بات سمجھنے میں دقت محسوس کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ ایک ہی ملک کے دو سروں پر بسنے والے باہمی افہام و تفہیم سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ زبانوں کا تعدد بھی فرق جغرافیائی خطوں کے درمیانی فاصلے بڑھنے کے باعث آخر میں آکر مکمل اجنبیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ زبانوں کی تقسیم ہے جن کا تشخص درمیانی فاصلے قائم کرتے ہیں۔

تو ایک زبان کے سماج میں بھی لوگ یکساں زبان نہیں بولتے۔ ایک ہی زبان کی معیاری اور غیر معیاری دو مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ معیاری زبان بولتے ہیں بعض غیر معیاری۔ ایک ہی شخص دو مختلف موقعوں پر، دو مختلف اوقات میں اور دو مختلف موضوعات سے متعلق گفتگو میں مختلف زبان استعمال کرتا ہے جسے اس کا انفرادی اسلوب یا طرز بیان کہتے ہیں۔ دو بولنے والوں کی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے کیونکہ ان کے ذخیرۂ الفاظ مختلف اور اسلوب بیان جدا جدا ہوتے ہیں۔ پھر ایک ہی لسانی سماج مختلف طبقات میں بٹا ہوتا ہے جن میں سے ہر طبقہ اپنی اپنی مخصوص زبان

۱۔ لینگویج، باب ہشتم ۲۔ ورڈز پر لسانیاتی ... ص ۴۸ ۳۔ لینگویج اینڈ لنگوسٹکس ص ۲۴

بولتا ہے۔ علمی زبان، مذہبی زبان، قانونی زبان، صحافتی زبان، فنی زبان اور عورتوں کی زبان وہ طبقاتی زبانیں ہیں جو الگ پہچان لی جاتی ہے۔ یہ معیاری زبانیں ہیں۔ اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد، عالم اور عامی مختلف پیشے والوں مثلاً مذہبی عالموں، ڈاکٹروں، سوداگروں، انجینئروں، وکیلوں، طبیبوں، نجومیوں، سائنس دانوں اور فن کاروں کی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کھیلوں کی اور تفریحات کی زبان بھی الگ الگ ہوتی ہے۔[1]

عورتیں مردوں سے الگ ہی بولی بولتی ہیں۔ ان کے لغات، محاورے، لہجے، روزمرے، دعائیں، بددعائیں، کوسنے، قسمیں اور اسالیب بیان بالکل نرالے ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ قدامت پرست ہوتی ہیں اور قدیم رسوم اور عادات سے وابستہ رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان پر بیرونی اثرات بھی اتنے نہیں پڑتے جتنے مردوں پر پڑتے ہیں کیونکہ مردوں کا تعلق باہر کی دنیا سے اور عورتوں کا تعلق گھروں کی اندرونی دنیا سے زیادہ ہوتا ہے اور گھر ایک قلعہ ہوتا ہے جس میں باہر کے اثرات کا نفوذ مشکل سے ہو پاتا ہے۔ عورتوں کے چند اردو الفاظ، مرکبات اور محاورات وغیرہ کی مثالیں دیکھئے۔

اوپر والیاں (چھپکلی، پریاں)۔ اوپر والا (چاند)۔ اندر والا (دل)۔ سبب (موت، انتقال)۔ اتر جانا (بچے کا مر جانا)۔ سدھارنا (رخصت ہونا، چلا جانا)۔ قرآن درمیان (ایک زندہ اور ایک مردہ انسان کا ساتھ ساتھ ذکر کرتے وقت)۔ بہشتی (مرحوم، مرا ہوا)۔ بی بی کا دامن (حضرت خاتون جنت کی نذر)۔ راجا باسک، ماموں، رسی (سانپ)۔ چوڑیاں بڑھانا یا ٹھنڈی کرنا (چوڑیاں توڑنا)۔ اجلی (دھوبن)۔ اللہ رکھے (دعا، خدا عمر دراز کرے)۔ مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے (دعا، اولاد اور شوہر سلامت رہے)۔ مانگ اجڑنا (شوہر کا مر جانا)۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو (دعا، خدا مال و دولت اور اولاد عطا کرے)۔ کوکھ جلی (وہ عورت جس کا بچہ مر جائے)۔ بڑی کتاب (قرآن مجید)۔ مردوا (مرد)۔ آیا گیا (اجنبی، اجنبی جسے اپنایا جائے)۔ گھوڑ چڑھے پیٹا (بددعا)۔ موا (بددعا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان مردوں کی داشتہ اور عورتوں کی سہیلی ہے۔ چنانچہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی بول چال میٹھی، آسان اور ہلکی پھلکی اور لہجے میں رسائی اور نرمی ہوتی ہے۔ زبان میں خوف، وسواس، شگون، شرم لحاظ اور شدید نیک و بد خواہشات اور آرزوئیں شامل رہتی ہیں۔

۱۔ وینڈریس لینگویج ص ۲۹۷۔ مثالوں کے لئے دیکھئے میری کتاب "اردو کی بحث" ص ۸۱

غیر معیاری زبان بولنے والوں میں بھی فرق ہوتا ہے مثلاً بھکیروں، مزدوروں، قصائیوں، بھٹیاروں، چڑی ماروں، مختلف کاریگروں اور راج مستریوں وغیرہ کی اپنی اپنی فنی اور اصطلاحی زبان ہوتی ہے۔ جہازی مزدور اپنی غیر معیاری بولی بولتے ہیں۔ ٹھگوں، لٹیروں، چوروں، عادی مجرموں، خونیوں اور قانون شکنوں کی بولی الگ ہوتی ہے۔ مداری، بازی گر اور سرکس تماشے والے اپنی اپنی بول چال رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں میں تدردی جیسی خفیہ زبانیں بھی بولی جاتی ہیں تاکہ کوئی دوسرا ان کی بات نہ سمجھ پائے۔[۱]

غرض جس طرف دیکھئے مختلف زبانوں اور بولیوں کا ایک گھنا جنگل اور ایک گتھا ہوا تانا بانا نظر آتا ہے اور زبان کی مختلف آوازوں کا ناہموار، اونچا نیچا اور بے ہنگم سا شور سنائی دیتا ہے۔

علاقائی فرق سے بھی ایک زبان کی مختلف شکلیں ہو جاتی ہیں۔ جب ایک زبان کسی سیاسی، کاروباری یا مذہبی سلسلے میں کسی دوسری زبان کے علاقے میں پہنچ جاتی ہے تو وہاں کے لوگ اسے اپنی مادری زبان کے ساتھ ملا کر بولنے اور لکھنے پڑھنے لگتے ہیں۔ اس طرح زبان کو سفر کرنے والی زبان کا مقامی محاورہ کہتے ہیں جیسے ویدک اور سنسکرت جو آریاؤں کی سفری بولی میں ہندوستان کی مختلف بولیوں کی ملاوٹ سے تیار ہونے والا محاورہ ہے۔ امریکی انگلش اور انڈین انگلش برطانوی انگریزی کے امریکی اور ہندوستانی محاورے ہیں جو امریکا اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کی آمیزش سے بنے ہیں۔ سبک ہندی ایران کی فارسی کا ہندوستانی محاورہ ہے جو فارسی میں ہندوستانی زبانوں کے میل سے تیار ہوا ہے۔ اکبر آبادی، دہلوی، لکھنوی اور حیدرآبادی اردو ہماری زبان کے مقامی محاورے ہیں جو معیاری اردو میں بالترتیب برج بھاشا، ہریانی، پنجابی اور دکنی زبانوں کے میل سے ابھرے ہیں۔[۲]

ایک زبان کا دوسری زبان پر اثر، مستعار لئے جانے والے الفاظ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ آوازوں، لہجوں، روزمروں، محاوروں، تلمیحوں، استعاروں، کہاوتوں اور اسالیب بیان وغیرہ تک جا پہنچتا ہے۔ جیمس اینڈرسن کہتا ہے کہ اسپین میں لاطینی زبان آئبیرین لہجے میں بولی جاتی تھی۔ اٹلی کے کچھ علاقوں میں اسے لوگ آسکن امبرین لہجے میں اور دوسرے علاقوں میں اٹرسکن یا یونانی لہجے میں بولتے تھے۔ رومانیا میں بلقانی زبانوں نے لاطینی کے تلفظ کو متاثر کر دیا تھا۔ ویدک اور سنسکرت میں ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ، ن اور ش کی آوازیں ہندوستان کی مختلف مقامی زبانوں سے داخل

۱۔ علم زبان، فیلر، ص ۲۳۹، ۲۳۰ ۲۔ اردو کی کہانی، [illegible] ص ۱۹۱

ہوتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ آوازیں دوسری آریائی زبانوں مثلاً فارسی اور یونانی وغیرہ میں نہیں ملتیں۔[۱]

آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ آج کل آئرلینڈ کے تمام انگریزی زدہ علاقوں کا مقامی محاورہ صوتیات اور صرف و نحو میں آئرش زبان سے متاثر ہے اور پیراگوئے کی گورانی انڈین زبان نے اس علاقے میں بولی جانے والی ہسپانوی زبان پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔[۲]

دوسری طرف جو زبان اپنے ہی علاقے میں کسی دوسری آنے والی زبان سے ملتی ہے وہ بھی اس کے اثرات قبول کرتی ہے اور اگر آنے والی زبان سیاسی یا ثقافتی بالادستی بھی رکھتی ہے تو یہ اثرات اور بھی گہرے اور دوررس ہو جاتے ہیں۔ اس برصغیر کی قریب قریب تمام زبانوں پر سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی کے اثرات اور ان اثرات کے تحت چھوٹی بڑی رد و بدل اس کا ثبوت ہیں۔[۳]

مختصر یہ ہے کہ زبان پوری زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ زمین کے مختلف ملکوں اور علاقوں میں اس کی مختلف قسمیں بولی جاتی ہیں۔ ہر علاقے میں انسانوں کا ایک ہی سماج بستا ہے جو ایک زبان بولتا ہے اور ہر دو علاقوں کے درمیان میں ایک ملواں زبان پائی جاتی ہے جس میں دونوں پڑوسی زبانوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ہر لسانی علاقے کا ایک مرکز ہوتا ہے جہاں زبان کا معیاری محاورہ بولا جاتا ہے لیکن جیسے جیسے مرکز سے نکل کر سرحد کی طرف بڑھتے جاتے ہیں اس کے معیار میں رعایت اور ضوابط میں نرمی ملنے لگتی ہے۔ پڑوسی زبان کی خصوصیات کا میل شروع ہو جاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے زبان کا گہرا رنگ ہلکا ہوتا جا رہا ہے یعنی ایک لسانی علاقے میں بھی دو مقامات کے رہنے والوں کی زبان بالکل ایک سی نہیں ہوتی۔ زبان کا دائرہ عمل کبھی جیومیٹری کی سی معین شکل میں نہیں ملتا اور دو زبانوں کے درمیان میں کوئی واضح حد فاصل بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ایک لسانی علاقے کی حد پار کر کے دوسرے لسانی علاقے میں دور تک نہیں پہنچ جاتے سرحد کے گزرنے کا علم تو علم احساس بھی نہیں ہو پاتا۔

ہر زبان میں بیک وقت متعدد رنگ نظر آتے ہیں۔ ہر لسانی علاقے میں سماج کے مختلف طبقوں کی بول چال میں تھوڑا تھوڑا سا فرق ملتا ہے۔ یہ طبقے پیشے، مشغلے، علم و فن، جنس (مرد، عورت)، مالی حیثیت اور تہذیب و ثقافت وغیرہ کے لحاظ سے بنتے ہیں۔ ہر طبقے کے افراد کی گفتگو بھی ایک

۱۔ جیمس اینڈرسن کی رائے کی [illegible] ان آوازوں کے ساتھ ساتھ ہکاری آوازیں (اسپریٹس) بھی ہندوستانی زبانوں سے ویدک اور سنسکرت میں آگئی ہیں کیونکہ یہ بھی دوسری آریائی زبانوں میں نہیں ملتیں۔ سہیل بخاری

۲۔ لسانیات [illegible] ص ۱۰۷، ۱۰۸ ۳۔ [illegible] ص ۱۰۶

دوسرے سے قدرے جدا ہوتی ہے اور خود ایک فرد بھی مختلف اوقات میں، مختلف حالات کے تحت مختلف موضوعات کے متعلق مختلف زبان استعمال کرتا ہے۔

زبانوں میں سدا سے لین دین ہوتا آیا ہے۔ جب دو زبانیں قریب آتی ہیں تو ایک کے دوسری پر اثرات پڑنے لگتے ہیں اور ان میں کچھ نہ کچھ فرق آجاتا ہے جس کے باعث وہ اپنے معیاری محاوروں سے ذرا سی ہٹ جاتی ہیں۔

زبان کے لئے کثیر رنگی اور اسلئے بہت سے متبادل روپ جو ایک ہی وقت میں نہ صرف ایک ہی سماج اور ایک ہی علاقے میں بلکہ دوسرے سماج اور دوسرے علاقے میں بھی پہلو بہ پہلو مل جاتے ہیں، اس کی ثروت کے منہ بولتے ثبوت اور اس کی مکانی وسعت کے آئینہ دار ہیں۔

زبان کی یہ بوقلمونی قوس قزح سے مشابہ ہے جس کے رنگ کی دھاریاں الگ الگ دور تک چلی جاتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوتیں۔ زبان کی طبقاتی شکلیں اور مقامی محاورے دراصل اس کے اصطلاحی رنگ ہیں جن کے متوازی خطوط کبھی ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوتے۔

تاریخی لسانیات کی دلدل میں ماہرین کے پھنس کر رہ جانے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے زبان کے مکانی مطالعے یعنی مکانی لسانیات کو پس پشت ڈال کر زبان کی بوقلمونی اور نیرنگی کو جو اس کی مکانی خصوصیت ہے تاریخی تبدیلی کا نام بھی دے دیا اور پھر اس نام نہاد تاریخی تبدیلی کے اسباب کا سراغ لگانے کو بھی چل کھڑے ہوتے۔ ظاہر ہے کہ اس بگڑی ہوئی صورت حال میں خیر کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے خود دھوکا کھایا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ جان لیونز اپنی اس غلطی کا اعتراف دبے لفظوں میں یوں کرتا ہے:

"مکانی بوقلمونی اور تاریخی تبدیلی میں واضح طور پر امتیاز کرنا ناممکن ہے۔"[1]

اور جینس ایچی سن کہتا ہے:

"زبانوں کی بوقلمونی کو ہم وقتی اور زبان کی تبدیلی کو بعد وقتی تصور کیا جاتا ہے۔"[2]

میرے نزدیک حقیقت ایک ہے جس کے دو نام رکھے گئے ہیں۔ ۱۔ مکانی یا تشریحی لسانیات اور زمانی یا تاریخی لسانیات۔ ۲۔ بوقلمونی اور تبدیلی۔ فی الواقع زبان کا ایک ہی مطالعہ درست ہے جسے مکانی یا تشریحی لسانیات یا صرف لسانیات کہہ سکتے ہیں اور اس کی ایک ہی خصوصیت ہے جسے رنگ برنگا پن یا بوقلمونی کہتے ہیں۔

۱۔ لنگویج اینڈ لنگوئسٹکس ص ۵۵ ۲۔ لسانیاتی تبدیلی ص ۳۵

زبان کا مطالعہ کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے متعلق ولیم اے ٹوسٹل کہتا ہے کہ زبان کا ایک نظام ہے اس لئے اس کے تجزیے کے قواعد ہونا چاہیں۔ وہ باہر سے جیسی نظر آتی ہے اس کے لحاظ سے اس نے اس مطالعے کے مندرجہ ذیل چار عنوانات قرار دیے ہیں:[1]

۱۔ فونیٹکس (علم آواز)
۲۔ فونیمکس (فونیم کا علم)
۳۔ صرف
۴۔ نحو

پی ایچ میتھیوز نے زبان کے تجزیے کو مندرجہ ذیل چار شاخوں میں تقسیم کیا ہے:[2]

۱۔ آواز کا مطالعہ
الف۔ صوتیات   ب۔ فونیٹکس (علم آواز)
۲۔ نحو۔ جملوں اور فقروں کی ساخت
۳۔ معنویات۔ لفظوں کے معانی کا مطالعہ
۴۔ صرف۔ مختلف استعمالات میں لفظوں کے روپ اور ان کی ساخت

جان لیونز زبان کے تجزیے کی مندرجہ ذیل چار سطحیں قرار دیتا ہے:[3]

۱۔ صوتیات
۲۔ صرف
۳۔ نحو
۴۔ معنویات

اکثر ماہرین لسانیات کم و بیش انھیں چار پہلوؤں پر متفق ہیں البتہ بہت سے صرف کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے اور اس کا مواد صوتیات اور نحو کے عنوانات میں بانٹ دیتے ہیں۔

پروفیسر ایل ایچ گرے نے اپنی کتاب میں البتہ ان سے ہٹ کر ایک اور راہ نکالی ہے اور زبان کے مندرجہ ذیل پہلو بتاتے ہیں:[4]

۱۔ مادی یا میکانکی
الف۔ صوتیات   ب۔ صرف

۱۔ اسکیچ آف لینگویج ص ۱۵ ۲۔ مورفولوجی ص ۱ ۳۔ ۔۔۔ ص ۴۳
۴۔ فاؤنڈیشنز آف لینگویج ص ۴۳

۲۔ التفاقیات (لغۃ)

۳۔ تفسیاتی یا غیر میکانکی

الف۔ نحو　　　　ب۔ معنویات

یہ تقسیم بھی مندرجہ بالا تقسیموں سے تقریباً ملتی ہے البتہ ناموں میں ذرا سی تبدیلی ہو گئی ہے اور اس تبدیلی میں گرے کا ذاتی نقطۂ نظر جھلکتا ہے۔

میرے خیال سے زبان کے مطالعے کا طریقہ طے کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کوئی ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کریں جو طبعی ہو اور قانونِ قدرت سے مطابقت رکھتی ہو۔ چنانچہ میں نے وظائفِ زبان کی بحث میں زبان کا جو آخری لیکن جامع اور ہمہ گیر وظیفہ بیان کیا ہے اس سے مطالعۂ زبان کا طریقہ اخذ کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

زبان سے دنیا کا گہرا تعلق ہے۔ وہ دنیا کو بیان کرنے کے لئے وضع ہوتی ہے اسی لئے اس میں پوری دنیا جھلکتی ہے یعنی دنیا جیسی پہلے تھی، جیسی اب ہے، جیسی آئندہ ہو گی اور جیسی ہونا چاہیے سب کچھ ہمیں زبان ہی بتاتی ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے زبان کی مشابہت دور تک چلی جاتی ہے اس لئے ہمیں زبان کا مطالعہ کرنے کے لئے دنیا پر نظر ڈالنا چاہیے جسے عالمِ موجودات کہتے ہیں یعنی جو صرف مادی موجودات کا ذخیرہ ہے بلکہ غیر مادی موجودات یعنی ہمارے خیالات و افکار کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ جس طرح دنیا زمان و مکان سے محدود ہے اسی طرح ہمارا تفکر اور تخیل بھی زمان و مکان سے اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ ہم ان سے ہٹ کر سوچنا بھی چاہیں تو نہیں سوچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے دنیا کو جس طرح سمجھا ہے اور اس کا جو تصور سامنے رکھ کر سوچا ہے اسی کے مطابق زبان کی تخلیق و تعمیر کی ہے۔

دنیا موجودات کے ذخیرے کا نام ہے اور زبان الفاظ کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ جس طرح اشیاء دنیا کی اکائیاں ہیں اسی طرح الفاظ زبان کی اکائیاں ہیں۔ شے دنیا کی جان نہیں بلکہ خود دنیا ہے۔ لفظ بھی زبان کی روح نہیں زبان ہے۔ ہمارے بزرگوں کے پیشِ نظر یہی حقیقت تھی جنھوں نے زبان کو "بولی" کہا ہے اور "بولی" کا لفظ "بول" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں لفظ۔ اس طرح بولی کا مطلب ہوا "بول والی" یا "بول کی"۔ اس طرح زبان کے مطالعے کے لئے لفظ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جو زبان کی اصل اور بنیاد ہے۔ اس لئے زبان کے مطالعے کی ابتدا لفظ سے کرنا چاہیے اور اسی پر اس کی انتہا ہونا چاہیے۔

پھر جس طرح اشیائے عالم عناصرِ اربعہ کے ملنے سے بنی ہیں اسی طرح الفاظ زبان بنیادی آوازوں کے ملنے سے تیار ہوتے ہیں۔ عجب دانا تھا جس نے حروف کو جو آوازوں کی بصری شبیہیں ہیں عناصرِ اربعہ کے خواص عطا کر کے چار درجوں خاکی، بادی، آبی اور ہوائی میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح دنیا یعنی اشیاء کی بنیاد عنصر پر اور زبان یعنی الفاظ کی بنیاد آواز پر قائم ہوئی۔ جو علم آوازوں سے متعلق ہے اسے لسانیات میں صوتیات کہتے ہیں۔

سائنس (طبعیات، کیمیا اور حیاتیات وغیرہ) تحلیل و ترکیب کے عمل سے اشیائے عالم کو جانچتی پرکھتی اور قدرت کے ان قوانین کا سراغ لگاتی ہے جو ان میں کام کر رہے ہیں۔ تحلیل و ترکیب کا یہی عمل لفظ پر بھی ہوتا ہے جو آوازوں کی اینٹیں چن چن کر تیار کیا جاتا ہے اور یہ عمل جس علم سے تعلق رکھتا ہے اسے لفظیات کہتے ہیں۔

خدا نے جو اشیائے عالم خلق کی ہیں ان کی غرض و غایت خود اس نے طے کی ہے کیونکہ خالق ہی اپنی یہ مصلحت خوب جانتا ہے کہ اس کی کون سی تخلیق سے کس مقصد کی تکمیل ہو سکے گی۔ اسی طرح واضعِ زبان نے بھی ہر لفظ کی تخلیق کے وقت اپنی مصلحتِ وقت کے مطابق اسے مناسب معنی عطا کر دیئے۔ یہ علم جو لفظ اور معنی کے رشتے اور معنی کی اقسام وغیرہ سے تعرض کرتا ہے معنویات کہلاتا ہے۔

اس سلسلے میں مشابہت کی آخری بات یہ ہے کہ جس طرح اشیائے عالم الگ الگ غیر مربوط اکائیاں نہیں ہیں بلکہ دنیا باہم سے ایک سلسلے میں منسلک ہو کر کائنات کی تنظیم قائم کرتی ہیں اسی طرح مختلف الفاظ باہم مل کر ایک مربوط انسانی کلام کا نظام قائم کرتے ہیں اور جو علم اس نظام سے بحث کرتا ہے اسے نظامیات کہتے ہیں جسے عرفِ عام میں گرامر یا قواعد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

زبان یا لفظ کے مطالعے کی یہ چاروں راہیں مندرجہ ذیل شجرے سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔

لفظ

صوتیات　　لفظیات　　معنویات　　نظامیات (گرامر)

صرف　　نحو

ان موضوعات کا سلسلہ وار بیان آگے آئے گا۔

تیسرا باب

صوتیات

ا۔ بنیادی آوازوں کی تقسیم اور تعداد:

مادہ مادے سے ٹکراتا ہے تو آواز دیتا ہے۔ مادے کی مختلف شکلوں کی مناسبت سے آوازوں کی قسمیں بھی مختلف ہو جاتی ہیں جن کی تعداد سات ہے۔ انھیں انگریزی میں واول (Vowel) اور اردو میں سر کہتے ہیں۔ یہی سر موسیقی کے ساز سے نکلتے ہیں اور یہی سر حیوانوں اور انسانوں کی چیخوں میں بھی سنائی دیتے ہیں لیکن یہ کبھی تنہا نہیں آتے بلکہ آوازوں کی ایک اور قسم کے سہارے نکالے جاتے ہیں جو خود سر نہیں ہے۔ اسے سنسکرت میں ویجن اور انگریزی میں کانسونینٹ (Consonant) کہتے ہیں اور میں نے اسے اسر (اَ= نہیں + سر یعنی جو سر نہیں ہے) کا نام دیا ہے کیونکہ اردو میں آوازوں کی جگہ عربی کی تقلید میں حروف کے نام ہوتے ہیں اور حروف کو حروف علت اور حروف صحیح میں تقسیم کرتے ہیں یعنی حروف علت سے سر اور حروف صحیح سے اسر مراد لیتے ہیں۔ اسر سروں کا مدار ہوتے ہیں، چنانچہ ہر سر کی ابتدا اسر سے ہوتی ہے یا دوسرے لفظوں میں ہر سر سے پہلے اسر آتا ہے۔

اسروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک بے رنگ اور دوسرے بارنگ۔ بے رنگ اسر کو پراکرت کے گرامر نویس ہیم چندر اور چنڈ اپنی اپنی گرامروں میں اودان اور شیش کہتے ہیں۔ عربی میں اسے ہمزہ کا نام دیا گیا ہے۔ اودان کے معنی ہیں بے رنگ اور شیش باقی کو کہتے ہیں۔ ان گرامر نویسوں کے الفاظ میں جب کسی لفظ سے کوئی اسر ساقط ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ یہی آواز باقی رہ جاتی ہے چنانچہ "نگر" کا لفظ گ کے سقوط کے بعد "نئر" ہو جاتا ہے یعنی اس میں گ کی جگہ ہمزہ آ جاتی ہے۔ بارنگ اسر بہت سے ہیں جیسے ب، پ، ت، ج، چ وغیرہ۔

مغرب کے ماہرین لسانیات علی العموم ہمزہ کی آواز سے بے خبر ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل سمجھنے کے لئے ذرا ذیل کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ کب = ک + زبر + ب

۲۔ جب = ج + زبر + ب

۳۔ تب = ت + زبر + ب

۴۔ اب = ا + زبر + ب

اسی نقشے کو اگر ہم رومن پی میں ظاہر کرنا چاہیں تو یوں لکھیں گے:

1. Kab = K + a + b

2. Jab = J + a + b

3. Tab = T + a + b

4. Aab = A + a + b

لیکن مغرب والے چوتھے لفظ کے تجزیے میں A کے وجود سے انکاری ہیں اور یہی دراصل ہمزہ ہے جیسا کہ آپ نے اردو نقشے میں ملاحظہ فرمایا۔ یہ لوگ لفظ "اب" کو رومن پی میں (Ab) لکھیں گے۔ اس کی ابتدا میں "A" نہیں لکھیں گے یعنی Aa اور ab کی دو مختلف آوازوں کو صرف ایک ہی آواز ab سے ادا کریں گے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمزہ اور زبر (مختصر سر) میں تمیز کرنے سے قاصر ہیں۔ البتہ ہے آر فرتھ نے اپنی کتاب میں ہمزہ (ء) اور ہائے ہوز (ہ) دونوں کی آوازوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے اور ہمزہ کی آواز کو بے رنگ، کمزور سر، چھوٹا سے چھوٹا سر، تجزی ساکن اور جسے سے بڑا اسر کہا ہے[1] لیکن اسے صوتی نظام کے بجائے بعض زبانوں کے عروضی نظام سے مخصوص بتایا ہے[2] یعنی وہ بھی اسے اچھی طرح نہیں سمجھ پایا ہے۔ اسٹارک اور ولڈن کہتے ہیں:

"بعض زبانوں میں گلشی اسر ایک جداگانہ آواز کی حیثیت سے عام ہے مثلاً جرمن زبان میں ہر لفظ جو سر سے شروع ہوتا ہوا لگتا ہے حقیقت میں گلشی اسر سے شروع ہوتا ہے[3]" اور آوازوں کے نقشے میں ہمزہ اور ہ کو گلشی اسروں میں دکھایا ہے۔ آر ایچ رابنس نے بھی اپنی کتاب میں اسروں کی جو فہرست دی ہے اس میں ہمزہ اور ہ کو گلشی اسروں کے طور پر شامل کیا ہے[4]۔

حقیقت یہ ہے کہ سر کسی بھی مادے کے ٹکراؤ سے کیوں نہ پیدا ہو اسر کی مدد کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتا اور دنیا کی کسی زبان کا کوئی لفظ کیوں نہ ہو اسر کے بغیر شروع نہیں ہو سکتا۔ ان اسروں میں بے رنگ اسر (ہمزہ) موسیقی کے راگوں اور جانداروں کی چیخوں میں سر ظاہر کرنے کے کام آتا ہے اور

۱۔ پیپرز ان لنگوسٹکس ص ۱۲۱ ۲۔ ایضاً ص ۲۲ ۳۔ لنگوسٹکس ص ۴۴ ۴۔ جنرل لنگوسٹکس ص ۹۰

اور ہسپانوی زبانوں میں سروں کی تعداد سات رہ گئی۔ سسلی کی زبان میں پانچ اور رومانیا کی زبان میں چھے سر رہ گئے ہیں[1]

میرے خیال سے مندرجہ بالا مختلف زبانوں میں سروں کی مختلف تعداد جو تاریخی تبدیلی کے نتیجے کے طور پر پیش کی گئی ہے وہ ان کی تحریروں سے متعین کی گئی ہے اور زبانوں کی ملفوظی صورت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ کسی زبان میں بھی سروں کی اتنی مختصر تعداد سے کام نہیں چل سکتا چنانچہ ان زبانوں کے سروں کی مندرجہ بالا تعداد ان کی تحریروں کے لحاظ سے درست مگر ملفوظی لحاظ سے ناقص ہے۔

برصغیر پاک و بھارت میں بولی جانے والی اردو اور اس کی معاصر زبانوں میں سات طویل اور سات مختصر سادہ سر اور پانچ طویل اور پانچ مختصر رکی سر بولے جاتے ہیں لیکن تحریر میں یہ نہ اردو کی عربی لپی میں اچھی طرح نظر آتے ہیں نہ ہندی کی دیوناگری لپی میں نہ ان سب کی نمائندگی ہو پاتی ہے۔ اردو اور ہندی بولنے والے اپنی اپنی لپیوں کو اٹکل سے پڑھ پڑھ کر اپنا اپنا کام چلاتے ہیں۔

دنیا کی زبانوں میں اسروں کی تعداد سروں کی تعداد سے زیادہ ملتی ہے۔ اسروں کی تقسیم علی العموم مخارج کے لحاظ سے کی گئی ہے یعنی ہونٹ، دانت، تالو، حلق وغیرہ کی مدد سے ادا ہونے والے اور ناک اور بھاری سانس کی مدد سے بولے جانے والے اسر۔ دنیا میں مختلف زبانیں بولنے والوں نے اپنے اپنے لئے اسروں کی مختلف تعداد اور قسمیں منتخب کی ہیں مثلاً اردو کی ٹ، ڈ، ڑ کی ہلکی آوازیں جنھیں الپ پران کہتے ہیں فارسی، عربی، یونانی، فرانسیسی وغیرہ میں نہیں ملتیں۔ بھ، تھ، کھ جیسی بھاری آوازیں جنھیں مہاپران کہتے ہیں جنوبی مغربی ایشیا، یورپ اور امریکا وغیرہ میں نہیں بولی جاتیں۔ فارسی کی پ، چ، ژ، گ عربی جیسی سامی زبانوں سے مفقود ہیں۔ عربی کی ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق فارسی، اردو اور اردو کی معاصر بولیوں اور یورپ کی زبانوں سے غائب ہیں۔ فارسی اور عربی کی مشترک آوازیں خ، ز، غ، ف بھی اردو، ہندی اور ان کی معاصر زبانوں میں ناپید ہیں۔ فارسی کی آواز ژ بھی ہماری زبانوں میں نہیں ملتی۔ ان مخصوص آوازوں میں سے اگر ہمارے یہاں کوئی آواز بولی بھی جاتی ہے تو وہ انھیں زبانوں سے مستعار لئے ہوئے الفاظ میں بولی جاتی ہے جنھیں دخیل کہتے ہیں۔ غرض دنیا میں بولے جانے والے اسروں کی کثیر تعداد ملتی ہے جن میں سے مختلف علاقوں کے باسیوں نے مختلف اسر منتخب کر کے اپنے اپنے لئے الگ الگ زبانیں گھڑ ڈالیں۔

اردو اور اس کی بعض معاصر زبانوں کے اسروں کا ایک نقشہ نیچے دیا گیا ہے۔

۱۔ ہالون فونولوجی ص ۲۰۸، ۲۲

مقدار / مخرج	الپ پران	مہاپران	الپ پران	مہاپران	الپ پران	مہاپران	کل تعداد
حنجری	ء (ہمزہ)	ہ					۲
حلقی	ک	کھ	گ	گھ			۴
[illegible]	چ	چھ	ج	جھ	ر	رھ	۶
[illegible]	ٹ	ٹھ	ڈ	ڈھ	ڑ	ڑھ	۶
دندانی	ت	تھ	د	دھ	ل	لھ	۶
شفوی	پ	پھ	ب	بھ			۴
انفی	م	مھ	ن	نھ	ڻ[1]		۵
صفیری	س						۱
کل تعداد							۳۴

اس سے پہلے کہ میں ان بنیادی آوازوں کی وہ مختلف کیفیتیں بیان کروں جو ان پر الفاظ میں استعمال ہونے کے بعد طاری ہوتی ہیں ان کے وہ جتھے درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جن میں یہ بٹی ہوتی ہیں۔ ان میں سے سروں اور اسروں کے الگ الگ دو دو جتھے بنتے ہیں۔ ہر جتھے کی تمام آوازیں ہم مزاج ہوتی ہیں لیکن سروں اور اسروں دونوں کے مطابق جتھوں کی آوازوں کے مزاجی کیف و کم میں اختلاف پایا جاتا ہے جس کا بیان مناسب مقام پر آگے آئے گا۔ ان کے جتھے یہ ہیں

طویل سر

پہلا جتھا: اُ ۔ اِ ۔ ئیں ۔ آ ۔ اوں ۔ ہ — کل تعداد ۵

دوسرا جتھا: اوں ۔ او ۔ ئے ۔ ایں ۔ یں ۔ ئیں — کل تعداد ۵

اسر

پہلا جتھا: ب ۔ پ ۔ تھ ۔ ٹھ ۔ ج ۔ چھ ۔ د ۔ ڈ ۔ ر ۔ ڑ ۔ ن ۔ کھ ۔ گ ۔ ل

ابتدائی: م ۔ ن

درمیانی اور آخری: مھ ۔ نھ ۔ و ۔ ی — کل تعداد ۲۰

۱۔ حلقی نون۔

دوسرا جتھا: بھ۔ پھ۔ تھ۔ ٹھ۔ چھ۔ جھ۔ دھ۔ ڈھ۔ رھ۔ ڑھ۔ کھ۔ گھ۔ لھ۔

ابتدائی: مھ۔ نھ۔ وھ۔ ۸

درمیانی اور آخری: م۔ ن۔ ل۔ کل تعداد ۲۰

اس نقشے سے ظاہر ہے کہ طویل سروں کے دو جتھے ہیں جن میں سے ہر ایک چھ چھ آوازوں پر مشتمل ہے۔ یوں طویل سروں کی کل تعداد ۱۲ ہے۔ اسروں کے بھی دو جتھے ہیں جن میں سے ہر ایک ۲۰، ۲۰ آوازوں پر مشتمل ہے۔ یوں جتھوں کے لحاظ سے جن میں بعض آوازیں دونوں طرف شامل ہیں اسروں کی مجموعی تعداد ۴۰ ہے۔ دونوں مختصر اور طویل سروں اور اسروں کو ملا کر کل تعداد ۳ + ۱۲ + ۴۰ = ۵۵ یعنی ۵۵ ہو جاتی ہے۔ اسروں میں کل ۱۹ مہاپران اور ۲۱ اسپ پران بولے جاتے ہیں۔

میں انھیں بنیادی آوازوں کو جن کا ذکر اوپر کیا گیا صوتی اکائیاں سمجھتا ہوں لیکن مغربی ماہرین صوتی اکائی صوتیے (فونیم) کو کہتے ہیں۔ صوتیے ان کی اتنی بڑی دریافت سمجھی جاتی ہے کہ آج لسانیات کا تقریباً ہر ماہر اور ہر طالب علم چاہے مغرب کا ہو چاہے مشرق کا اس کا ذکر بڑے طمطراق سے کرتا ہے۔ دراصل اہل مغرب کا رنگ برنگا تلفظ فونیم کی دریافت کا اصل سبب بنا ہے۔ صوتیات کا ایک عالمگیر اصول یہ ہے کہ ہر آواز کے لئے ایک جداگانہ حرف مقرر ہو اور ہر حرف ایک ہی آواز کی نمائندگی کرے لیکن مغرب میں آوازوں اور حرفوں دونوں میں سخت بے اعتدالی ملتی ہے چنانچہ انگریزی میں ایک ایک حرف کئی کئی آوازوں کی ترجمانی کرتا ہے اور ایک ایک آواز کئی کئی حرفوں سے ادا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے تلفظ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی بنیادی آواز لفظ کی ابتدا، درمیان اور اخیر میں بدل بدل جاتی ہے اور ہر جگہ ایک دوسرا ہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ایک آواز کے یہ مختلف رنگ جنھیں الوفون کا نام دیا گیا ہے اپنے اپنے فونیم کا کنبہ کہلاتے ہیں۔ مثلاً (L) کی آواز سنئے تو لک (Look۔ نظر) میں کچھ اور ہے، کلاس (Class۔ جماعت) میں اور ہے اور ہال (Hall۔ بڑا کمرہ) میں بالکل ہی مختلف صورت میں ادا ہوتی ہے۔

اردو اور اس کی معاصر زبانوں کی بات اس سے قطعی الگ ہے۔ ہمارے یہاں ہر آواز ہر جگہ ایک ہی طرح سے ادا ہوتی ہے اس لئے ہماری زبانوں کو نہ فونیم سے کوئی کام ہے نہ الوفون سے کوئی تعلق۔ مغرب میں بھی فونیم کی زیادہ سے زیادہ افادیت یہاں لوگوں کو انگریزی پڑھانے تک محدود ہے کہ اس کی صحیح صحیح ادائگی کرائی جائے یعنی جماعت میں اس کے درست اور مختلف تلفظ کی مشق کرائی

جائے لیکن لسانیات کو تو مغرب میں بھی اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ فونیم کے مختلف الوفونوں میں تقسیم ہو جانے سے یعنی فونیم کے الوفون مختلف ہو جانے سے لفظ کے معنی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور زبان کو معنی ہی سے کام ہے۔ اس نقطۂ نظر سے لسانی صوتیات میں اس کا ذکر ہمیشہ فعل عبث، کار بے خیر اور تضیع اوقات ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فونیم کی دریافت کوہ کندن و کاہ برآوردن بلکہ کچھ نہ برآوردن کی مصداق ٹھیرتی ہے۔

زبان کی بنیادی آوازوں کی تقسیم اور تعداد کے اس بیان کے بعد اب یہ ضروری ہے کہ لفظوں میں ان کے استعمال ہونے پر انھیں جو واقعات پیش آتے ہیں اور ان پر جو کیفیات گزرتی ہیں ان کا ذکر کیا جائے یعنی یہ بتایا جائے کہ ان کی ادائگی کن شرائط کے ساتھ ہوتی ہے۔ کون سی آواز کس آواز کے قریب آ سکتی ہے۔ کون سی کس سے دور رہتی ہے۔ کون سی حذف ہو جاتی ہے۔ کب واپس آ جاتی ہے۔ کب بدل جاتی ہے اور کس سے بدل جاتی ہے۔ غرض یہ اور ان جیسے بہت سے سانحات اور حادثات جن سے یہ آوازیں لفظوں میں دوچار ہوتی ہیں اگلے صفحات میں مختلف عنوانوں کے تحت تفصیل سے پیش کئے جاتے ہیں۔

۲۔ صوتی سنگت:

لفظ میں سروں اور اسروں کے استعمال سے متعلق مختلف زبانوں میں مختلف قاعدے اور اصول بنائے گئے ہیں۔ اردو کے چند عام قاعدے نیچے درج کئے جا رہے ہیں۔ یہ تمام قاعدے جزوی استثنا کے ساتھ اس کی تمام معاصر زبانوں میں بھی ملتے ہیں۔

۱۔ جس اسر کے بعد سر آتا ہے اسے متحرک اور جس اسر کے بعد کوئی سر نہیں بولا جاتا اسے ساکن کہتے ہیں اور ان کی حالتوں کو بالترتیب حرکت اور سکون کا نام دیا گیا ہے۔

۲۔ دو سر مسلسل نہیں بولے جا سکتے جب تک کہ ان کے درمیان ایک اسر نہ آ جائے۔ اس لئے اردو میں انگریزی وغیرہ کی اپ تھونگ جیسی آوازیں نہیں ہوتیں۔

۳۔ سر ہمیشہ اسر کے بعد بولا جا سکتا ہے اس لئے سر سے کوئی لفظ شروع نہیں ہو سکتا اور مختصر سر پر کسی لفظ کا خاتمہ بھی نہیں ہو سکتا لیکن سنسکرت، عربی اور فارسی وغیرہ میں آخری حرف بھی متحرک ہوتا ہے۔ فارسی لفظ کے آخری حرف کا زبر جا بجا ہائے ہوز اور کاف سے بدلا ہوا نظر آتا ہے جیسے بندہ، بندک اور مژدہ، مژدک جن کی جمعیں بندگاں اور مژدگاں ہو جاتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ

ونس، میرلس، مرنچا، گرنچ وغیرہ۔

۷۔ اردو کے کسی لفظ میں متواتر دو زیر یا دو پیش نہیں آ سکتے مثلاً اردو "ملک" سے ہم نے دو لفظ "مُلکیرنا" اور "مُلکرنا" بناتے ہیں لیکن "سُنک" سے "اُوڑ" کا لاحقہ لگا کر "سُنکوڑنا" نہیں بنایا بلکہ سین کو مکسور کر کے "سِکوڑنا" بولا۔ اسی طرح "بِکھ" کے مادے پر "ار" کا لاحقہ لگا کر "بِکھرنا" بنایا لیکن "ایر" کا لاحقہ لگا کر "بِکھیرنا" نہیں بنایا بلکہ ب کو مفتوح کر کے "بَکھیرنا" بولا۔ چند اور مثالیں یہ ہیں۔ بِگڑنا اور بگیڑنا۔ جھکنا اور جھکیٹنا۔ نپٹنا اور نپیڑنا وغیرہ۔ یہی سبب ہے کہ ہم انگریزی کے لفظ "وِکِٹ" کو کاف مفتوح سے "وِکَٹ" اور "مِنِٹ" کو نون مفتوح سے "مِنَٹ" بولتے ہیں۔

اگرچہ پڑھے لکھے اہل اردو کو بدیسی الفاظ کے اصلی تلفظ کی کچھ زیادہ ہی فکر رہتی ہے لیکن عوام بدیسی الفاظ کے لئے بھی اپنا دیسی طرز تلفظ ہی کام میں لاتے ہیں اور پنجاب میں تو پڑھے لکھے بھی دیسی طرز تلفظ قائم رکھتے ہیں اور اُصُول کو اَصُول، حُکُومت کو حَکُومت، ضَرُور کو ضُرُور اور جُنُون کو جَنُون بے دھڑک بولتے ہیں۔

۸۔ جس لفظ میں تین اسر آتے ہیں ان کے درمیانی اسر پر پیش نہیں بولا جاتا۔ اس کے برعکس ہزارہ اور ایبٹ آباد وغیرہ کے نواح میں درمیانی اسر کو مضموم بولنے کا چلن ملتا ہے جیسے کُلُٹ، پُکُڑ، بُکُڑ وغیرہ۔

۹۔ جس لفظ میں تین اسر آتے ہیں اس کا درمیانی اسر مکسور نہیں بولا جاتا۔ ہم انگریزی کے وکٹ کے کاف کو اور منٹ کے نون کو اسی وجہ سے مکسور نہیں بولتے اور انگریزی کلپ کو بھی کلپ بولتے ہیں۔

۱۰۔ کسی لفظ میں لگاتار تین اسر متحرک نہیں ہو سکتے اسی لئے اہل اردو عربی لفظ "کَلِمَہ" کو "کَل + مَہ" اور لفظ "عَرَبی" کو "عَر + بی" اور فارسی "گُزَران" کو "گُز + ران" بولتے ہیں اور اگر اردو کے لفظ پر لاحقے لگانے سے ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو حرکت اور سکون میں تبدیلی کر لیتے ہیں چنانچہ "ڈگر" (راستہ) پر لاحقہ جمع "اوں" بڑھا کر اسے "ڈگَروں" نہیں بولتے بلکہ گ کو ساکن کر کے "ڈگروں" بولنے لگتے ہیں۔ اردو میں یہ تبدیلی اکثر پیش آتی رہتی ہے جس کا بیان آگے بھی آئے گا۔

۱۱۔ کسی وجہ سے کسی اسر کے مختصر ہو جانے پر اس کا عنصر بول چال سے اکثر و بیشتر ساقط ہو جاتا ہے اور پھر تحریر میں بھی نظر نہیں آتا جیسے باتنا سے بٹنا۔ کھینچنا سے کھنچنا۔ بھونکنا سے جھکنا۔ کانپ سے کپکپی۔ ڈھانک سے ڈھکن وغیرہ۔

اردو میں ہر لفظ اسر سے شروع ہوتا ہے اور اسر یا طویل اسر پر ختم ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے یہاں عربی کے شمع اور وضع جیسے لفظ نہیں ہوتے چنانچہ اہل اردو عربی کے ان الفاظ کو "شما" اور "وضا" بولتے ہیں۔

۴۔ ر، ڑ، ڑھ، ہ اور ں (حلقی نون) سے کسی لفظ کی ابتدا نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی لفظ حلقی نون (ں) پر ختم ہو سکتا ہے لیکن بنٹو، سواحلی اور سوڈانی زبانوں میں حلقی نون سے بھی لفظ شروع ہوتے ہیں جیسے سواحلی نگما (ngoma = ڈھول) اور سوڈانی انگاڈن (انگڈن) = دُم[1]

۵۔ لفظ کے ابتدائی اسر کے بعد اسر کا آنا لازمی ہے یعنی کسی لفظ کا ابتدائی اسر ساکن نہیں بولا جا سکتا بلکہ یہ بات تو دنیا کی تمام زبانوں کے لئے لازمی ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف بات کرتے ہیں وہ دراصل بول چال سن کر نہیں تحریر پڑھ کر ایسا سمجھتے ہیں مثلاً انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی کی تحریروں میں لفظوں کی ابتدا اور آخیر میں کئی کئی اسروں کے مجموعے نظر آتے ہیں لیکن ان کی بول چال میں یعنی تلفظ میں تحریر سے مطابقت نہیں ملتی اور جہاں کتابی اور ملفوظی روپوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں تلفظ بگاڑ دیا ہے مثلاً انگریزی کے لفظ "اسکول" کا تلفظ ہمارے یہاں بہت زیادہ بگاڑ دیا ہے حالانکہ جرمن زبان میں اس کا تلفظ "شولا" ہے اور یہی صحیح بھی ہے کیونکہ تین حروف ایس۔ سی۔ ایچ (SCH) کا جٹ صرف ش کی آواز کے لئے لکھا جاتا ہے اس کا ثبوت بہت سے دوسرے الفاظ جیسے شیڈول، شوپن ہار، شلیگل وغیرہ سے مل جاتا ہے۔

۶۔ کسی لفظ کے آخری دو اسر ساکن نہیں بولے جا سکتے۔ یہی قاعدہ ملائی زبان میں بھی ہے لیکن فارسی کے کثیر تعداد لفظوں میں آخری دو اسر ساکن بولے جاتے ہیں۔ چونکہ اردو اور اس کی معاصر زبانیں بولنے والے ایسے تلفظ کے عادی نہیں ہیں اس لئے پنجابی بولنے والے دوست کو دو + ست، گوشت کو گو + شت اور درخت کو در + خت بولتے ہیں اور اہل اردو ایسے لفظوں کا آخری اسر ہی بول چال سے ساقط کر دیتے ہیں چنانچہ وہ دوست کا تلفظ دوس اور گوشت کا تلفظ گوش کرتے ہیں اور اگر تین اسروں کے لفظ میں درمیانی اسر ساکن ہوتا ہے تو اسے متحرک کر لیتے ہیں چنانچہ وہ عربی فِکر کو فِکَر اور غرض کو غَرَض اور پنجابی میں فارسی تخت کو تَخَت بولتے ہیں البتہ آخری اسر سے پہلے آنے والا دہانی نون، حلقی نون (ں)، ر، یا س اس چلن سے مستثنیٰ ہوتا ہے اور ساکن بولا جاتا ہے جیسے گرنت، تحفہ، تنت، ملنگ، بھنگ، پنچھ، سنکھ، لنت، جنت، کنت، بنت (پیچ کے ساتھ)، کلپ، سنکلپ، ارتھ۔

[1] جرنل لنگوسٹکس ص ۳۲

ا۔ دو آوازیں اپنی اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں جگہ بدلتی ہیں یعنی،

پہلی + دوسری = دوسری + پہلی　　مثلاً

دن سار (بجھڑا) ۔ تکلنا کتلنا ۔ لکھنؤ نکھلؤ (یوپی بھارت کا ایک شہر) ۔ پاتھنا تھاپنا ۔ کور روک ۔ بجلا بچلا ۔ کون نوک ۔ کدر رکد ۔ بھگری بگھری (بچھڑی) ۔ چھلنی چھنری (چالاک عورت) ۔ تال لات (بلندی) ۔ تام مان (عزت) ۔ مسکانا کمسانا (بڑھانا ۔ اچھال دینا) ۔ متکی ملتی (مالش ، رکاوٹ) ۔ گونجنا جوگنا ۔ ناڈنا ناندا ۔ دوکنا کودنا ۔ توبڑنا بوڑنا ۔ ساگلنا گالسنا (جوڑنا) ۔ تکین نکین (ہنسی) ۔ کک کال (سیاہی) ۔ ڈانگر گانڈر (بنجر اور ناہموار زمین) ۔ چکھا چکا (چونکا دینے والا ، کرشمہ ، دھوکا) ۔ ریلس ریلسا سیر سیر (سیلا سیلا ، آہستہ آہستہ) ۔ انگریزی ٹینک اردو ٹنکس ۔ جاپانی رکشا اردو عوام رکشا ۔ رجائی (رزائی) جرائی (جاڑوں کی) ۔ اردو رال (لعاب دہن) عربی لعاب شائد ۔ اردو کیچڑ پنجابی چکڑ ۔ اردو بڑا عربی بحال شائد بلدو (واپس) ۔ اردو نار پنجابی ران (عورت) ۔ اردو نوک پنجابی کھنڈ (نوک) ۔ اردو رت جگا پنجابی جگراتا ۔ لعنت نعلت ۔ مجوز مزاج ۔ جوزہ زوجہ ۔ کانکا کانٹا ۔

ب۔ ایک لفظ کی دو اگلی پچھلی آوازیں ہلکی سے بھاری اور بھاری سے ہلکی ہو کر آپس میں جگہ بدل لیتی ہیں۔ اس کی بھی مزید دو قسمیں ہیں۔ یعنی:

الف۔ ہلکی + بھاری = بھاری + ہلکی

ڈھو بندی ڈھونٹ بندی ۔ دھاڑیں داڑھیں ۔ گھڑنا گڑھنا ۔ تکھار بکھار ۔ گھمیرا گھمبیرا ۔ گھر گرہ ۔ گدھا گدا ۔ اردو جھوٹ ہندی جوٹھ ۔

ب۔ بھاری + ہلکی = بھاری + ہلکی　یا　بھاری + ہلکی = بھاری + ہلکی　　مثلاً

کھاپ پھانک ۔ ٹھوکنا کھوٹنا ۔ چھیک (چھینک) کھیپ ۔ اردو گڑھ میں پنجابی گھڑ ۔

نوٹ :۔ ہلکی اور بھاری آوازوں پر ان کے سمجھنے کے نمبر دے گئے ہیں۔

۵۔ صوتی تبادل:

بعض آوازیں بعض آوازوں سے بدل جاتی ہیں یعنی ان میں ایک قسم کی مساوات قائم ہے اور مساوات اس اصول پر مبنی ہے کہ لفظ کے دونوں روپوں میں معنی ایک ہی رہیں اور ان کی صحت کو کوئی

(اس اصول کی رو سے [illegible] الفاظ کی [illegible] غلط ہے جو عوام الناس میں [illegible] ہوتے ہیں
کھٹا ، کھٹا ، [illegible]
اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں [illegible] ہو جاتا ہے۔

گزر دیکھیے۔ زبان میں یہ ایک بہت دامن دار اور وسیع قسم کا عمل ہے اور میرے خیال کی حد تک دنیا کی تمام زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ مغرب کے ماہرین لسانیات صوتی تبادل سے زبانوں کے تقابلی مطالعے کے نتیجے میں واقف ہوئے اور اسے کسی طبعی، جسمانی یا سماجی حادثے کا نتیجہ سمجھ بیٹھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر لسانی معاشرے کے انسان نے اسے زبان کے نظام میں ایک ٹھوس اصول کے طور پر شامل کیا ہے۔ زبان سراسر تبادلات کا نظام ہے۔ یہ کلیہ صوتی تبادل سے جتنے موثر طور پر ثابت ہوتا ہے اتنے بھرپور انداز میں اور کسی عمل سے طے نہیں ہوتا۔

انسان نے مختلف لسانی معاشروں میں زبان کے بنیادی اصول و قواعد تو انسانی فطرت کے مطابق رکھے ہیں اس لئے تمام زبانوں میں بہت سی خصوصیات مشترک ملتی ہیں لیکن تفصیلات میں اس نے اپنے اختیار و انتخاب سے تبادلات کے ڈھیر لگا دئے ہیں چنانچہ مختلف زبانوں کے گلستانوں میں رنگ و بو کا کہیں کم اور کہیں زیادہ فرق نظر آتا ہے۔ یہ فرق زبانوں کے صوتی تبادل میں بہت واضح ہے۔ چونکہ مغربی ماہرین نے صوتی تبادل کو ایک حادثہ سمجھ کر اس کے اسباب خارج میں تلاش کرنے پر اپنا پورا زور صرف کر دیا اس لئے وہ اس کی وسعت اور اہمیت پر اچھی طرح غور نہیں کر پائے اور نتیجے میں ایسی غلطیاں کر بیٹھے جن کے ازالے کی سخت ضرورت ہے۔

زبان کی بنیاد آواز ہے اس لئے زبان کے مطالعے کی پہلی شرط آوازوں کا مطالعہ ہے۔ مکانی یا تشریحی لسانیات کی اہمیت یہیں معلوم ہوتی ہے اور تاریخی لسانیات کی کمزوری کا حال بھی اسی جگہ کھل جاتا ہے جس نے مختلف زبانوں کے چند مشترک لفظوں اور چند مشترک آوازوں پر ہی اپنا پورا زور صرف کر دیا اور ناقص نظریات قائم کر لئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا میں بولی جانے والی زیادہ سے زیادہ زبانوں میں سے ہر ایک کی بنیادی آوازوں کا بھرپور مطالعہ کیا جائے اور لفظوں میں ان کے استعمال کے امکانات کا جائزہ لیا جائے کیونکہ لفظ سے نکال کر آواز کا الگ تھلگ مطالعہ لسانیات کے لئے اب تک بے ثمر ثابت ہوا ہے اور آئندہ بھی بے فیض ثابت ہو گا۔

صوتی تبادل زبان کا ایک ایسا عالمگیر اصول ہے جس کے اسباب زبان سے باہر تلاش کرنا نادانی ہے۔ یہ اصول ہر لسانی معاشرے میں اس طرح رچ گیا ہے کہ توتلے بچوں اور بوڑھوں کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ میں بھی اس کے کرشمے نظر آتے ہیں۔ مغرب کے جو ماہرین لسانیات اسے زبان کی بیماری یا بولنے والوں کی غلطی سے تعبیر کرتے ہیں وہ ان مثالوں سے سبق لے سکتے ہیں جو میں ایک ایسی چھوٹی سی بچی اور ایک ایسے کہن سال بزرگ کی گفتگو سے لے کر یہاں پیش کر رہا

ہوں جنھیں گفتگو کی حد تک جسمانی طور پر کمزور یا علیل کہا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے میرے ایک مسائے اقبال رشید کی ایک بچی فرحانہ کی گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔ اس کی عمر تین سال ہے اور تتلا کر بات کرتی ہے۔ میں نے اس سے گفتگو کر کے اردو کے چند الفاظ کا جو تلفظ حاصل کیا ہے وہ میں یہاں درج کرتا ہوں۔

لفظ	تلفظ	لفظ	تلفظ	لفظ	تلفظ	لفظ	تلفظ
کتا	تتا	کشتی	تشتی	لڑکا	لڑتا	بکری	بتری
کبوتر	بوتر	قینچی	تینچی	قائد اعظم	تائد اعظم	کھڑکی	تھڑتی
کھانا	تھانا	گنبد	دنبد	گاجر	داجر	کشمیری	دشمیری
گئی	دئی	گلاسے	دلاسے	گاڑی	داڑی	گھڑی	دھڑی
گھوڑا	دھوڑا						

ان الفاظ کے مطالعے سے مندرجہ ذیل تبادل ہاتھ آتے ہیں:

۱۔ ک، ق = ت   ۲۔ کھ = تھ   ۳۔ گ = د   ۴۔ گھ = دھ

پہلے اور چوتھے نمبر کے اسم دوسرے تیتھے کے ہیں اور باہم متبادل ہیں اور دوسرے اور تیسرے نمبر کے اسم پہلے تیتھے سے تعلق رکھتے ہیں اور آپس میں بدل رہے ہیں۔ یہ حلقی اور دہانی اسموں کا سیدھا سادہ سا تبادل ہے جس کا آپ اگلے صفحات میں پیش کیے جانے والے تبادل سے تقابل کر کے مزید اطمینان کر سکتے ہیں۔

اب میں ایک بزرگ کی گفتگو کے چند الفاظ پیش کر رہا ہوں جو تتلے نہیں تھے بلکہ ٹوٹل تھے یعنی ان کی زبان سے مذکورہ بچی کے ت، تھ، د، دھ کے برعکس ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ کے اسم نکلتے تھے۔ نیچے ان کے ادا کیے ہوئے کچھ الفاظ کے مقابلے میں اردو کے اصل الفاظ بھی درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ٹان پر مجھے ٹول ٹل ٹئی (کان پر سے گولی نکل گئی)

۲۔ ڈھوڑے مر ڈئے ڈڈھوں ٹو داغ (گھوڑے مر گئے گدھوں کو داغ)

۳۔ ٹھانا (کھانا)۔ ٹھیٹ (کھیت)۔ محبٹ (محبت)۔ ڈین و ڈنیا (دین و دنیا)۔ ڈو باٹیں (دو باتیں)۔ پٹنڈ (پسند)۔ بنڈاگی (بندگی)۔ ٹڈے (مجھے)۔ ٹڈے (مجھے)۔

اب ان الفاظ کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ کان ٹان۔ نکل ٹل۔ محبت محبٹ۔ کھیت ٹھیٹ۔ باتیں باٹیں۔ کو ٹو۔   (ک، ت = ٹ)

۲۔ مجھے ٹڈے۔ تجھے ٹڈے۔ گھوڑے ڈھوڑے۔ گدھوں ڈڈھوں۔   (ج، جھ، گھ = ڈ، ڈھ)

۳۔ گولی ڈولی۔ گئی ڈئی۔ بندگی بنڈاگی۔ گئے ڈئے۔ دین و دنیا ڈین و ڈنیا۔ دو ڈو۔ پسند پٹنڈ
(گ، د = ڈ)

۴۔ کھانا ٹھانا۔ کھیت ٹھیٹ۔ سے مجھے۔ پسند پٹنڈ۔   (س، کھ = ٹھ)

یہاں پہلے اور دوسرے نمبروں کے اسم دوسرے تیتھے سے تعلق رکھتے ہیں اور باہم متبادل ہیں اور تیسرے اور چوتھے نمبروں کے اسم پہلے تیتھے کے ہیں اور آپس میں بدل رہے ہیں اور سب کے سب ان بزرگ کی زبان سے ٹی بن کر نکل رہے ہیں۔ اس تبادل کی بھی تصدیق و توثیق اگلے صفحات میں پیش کیے جانے والے صوتی تبادل سے کی جا سکتی ہے اور یہ اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ زبان کی بے استعدادی یا جسمانی بیماری کے باوجود ایک بچی اور بزرگ دونوں کی گفتگو کے صوتی تبادل میں اردو زبان کے اصل اور معیاری تبادل سے کہیں بھی سرمو انحراف نہیں ہے۔

تشریحی یا مکانی لسانیات کو نظر انداز کر کے ماہرین لسانیات نے تقابلی یا تاریخی لسانیات کی مدد سے اب تک جو لسانی تیتھے بنائے ہیں وہ غلط ہیں اور ان پر نظر ثانی کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس تیتھے بندی کی بنیاد سطحی مطالعے پر رکھی گئی ہے جس میں چند الفاظ کا بودا سہارا لے کر بیشتر تاریخی انقلابات اور ان کے سلسلے میں بعض تخیلات، مفروضات اور تعصبات کو رہبر بنایا گیا ہے۔ مثلاً ماہرین ایک عرصہ دراز سے یہ راگ الاپتے چلے آ رہے ہیں کہ اردو اور اس کی پڑوسی زبانیں بھی آریائی یا ہند آریائی ہیں۔ میرے نزدیک یہ ان کی غلط فہمی نہیں بلکہ خوش فہمی ہے اور نافہمی ہی نہیں بلکہ بے جا جرأت، جسارت اور اعتماد سے بات کرتی ہے۔

مثال کے طور پر آریائی زبانوں میں مصمت اور غیر مصمت آوازوں کا تبادل ملتا ہے جیسے (ب = پ) آب آپ، بادشاہ پادشاہ۔ (ت = د) بادد بادت، دراج تراج، زردشت زرتشت، سنسکرت بجرا تر فارسی بدر، سنسکرت پتر فارسی پدر۔ (ج = چ) جغد چغد (بوم)، جغند چغند (انگور کی بیل)۔ (ک = گ) شکوز شگوز، کشودن گشودن، کداختن گداختن وغیرہ۔

اردو اور اس کی پڑوسی زبانوں میں مجھے آریائی زبان کے یہ اصول نہیں ملتے بلکہ ان کی جگہ قطعی مختلف اصول نظر آتے ہیں جو نہایت ہی مستحکم اور عام ہیں۔ میں نے یہ اصول اردو بول چال سے دریافت کر کے مساواتوں کی صورت میں مرتب کر دیے ہیں۔ ذیل میں ان کی مثالوں سمیت تفصیلات تبادل کی دو موٹی موٹی قسموں (سادہ اور مرکب) کے تحت یکجا کر دی ہیں اور ان کے مشرح بیان سے

۹۔ تشدید:

کسی لفظ کی ایک ہی آواز کے دو بار بولنے کو تشدید اور اس آواز کو مشدد کہتے ہیں۔ یورپی زبانیں اس صوتی عمل سے خالی ہیں۔ اگرچہ ان کے کثیر تعداد الفاظ میں ایک ہی حرف دو دو بار لکھا ہوا ملتا ہے لیکن اس بات کا تعلق ان کے تلفظ سے نہیں ہے بلکہ صرف تحریر سے ہے۔ دوہرے حروف خاص طور پر انگریزی کے ان الفاظ میں نظر آتے ہیں جن میں اَ ے (u) ، اَو (ɔ) اور اِ (i) کے سر بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ جن الفاظ کے مادوں میں یہ سر ملتے ہیں ان پر لاحقوں کے اضافے سے صرف تحریر میں حرف کی تکرار ہو جاتی ہے آواز کی تکرار نہیں ہوتی۔ چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

بیٹ (bat ، گیند پر بلا مارنا) سے بیٹنگ (batting ، گیند پر بلا مارنے کا عمل)۔ چیٹ (chat ، بات چیت کرنا) سے چیٹنگ (chatting ، بات چیت)۔ بیگ (beg ، مانگنا) سے بیگر (beggar ، منگتا)۔ سیٹ (set ، ترتیب دینا) سے سیٹر (setter ، ترتیب دینے والا)۔ پوٹ (pot ، برتن) سے پوٹر (potter ، برتن والا ، کمہار)۔ روٹ (rot ، سڑنا) سے روٹن (rotten ، سڑا ہوا)۔ سوب (sob ، سسکیاں لینا) سے سوبنگ (sobbing ، سسکیاں لینے کا عمل)۔ گوڈ (god ، دیوتا) سے گوڈس (goddess ، دیوی)۔ سٹ (sit ، بیٹھنا) سے سٹر (sitter ، بیٹھنے والا)۔ اسپٹ (spit ، تھوکنا) سے اسپٹون (spittoon ، تھوکنے کا برتن)۔ نٹ (knit ، بننا) سے نٹنگ (knitting ، بننے کا فعل)۔ بڈ (bid ، بولی لگانا) سے بڈر (bidder ، بولی لگانے والا) وغیرہ۔

تشدید آریائی زبانوں سے بھی غائب ہے چنانچہ یونانی اور فارسی میں اس کا نشان نہیں ملتا اور سنسکرت کے بھی اس جزو سے غائب ہے جو سنسکرت الاصل ہے۔ عربی زبان میں البتہ اس کا بہت دور دورہ ہے اور اس برصغیر کے شمالی حصے میں بولی جانے والی زبانوں میں بھی اس کا چلن عام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان زبانوں میں سے بعض میں تشدید کی کثرت اور بعض میں کمی ہے لیکن تشدید سے کوئی زبان خالی نہیں ہے۔ برج بھاشا میں اردو زبان سے کم لیکن سہارن پور، مظفر نگر اور میرٹھ کے اضلاع میں اردو کے مقابلے میں بہت زیادہ تشدید بولی جاتی ہے۔

عربی زبان میں تشدید کا تعلق سروں سے ہے لیکن ان میں بعض مشدد اور بعض ہمیشہ غیر مشدد بولے جاتے ہیں۔ عربی میں مشدد حروف کی قسم شمسی اور غیر مشدد حروف کی قسم قمری کہلاتی ہے مثلاً عربی کے مرکب فی الدّین میں دال شمسی ہے یہی وجہ ہے لفظ "فی" کا حرف فائے مکسور "ال" کو

دیہی بھارت میں برج کے علاقے کی زبان۔ مدھیہ (بھارت)۔

پھلانگتا ہوا دے جا کر ملتا اور اسے مشدد کر جاتا ہے۔ چنانچہ اس مرکب کو "فِدّین" بولتے ہیں لیکن ف کا حرف قمری اور غیر مشدد ہے اس لئے عربی ترکیب "فی الفور" میں لفظ "فی" کا حرف فائے مکسور "فور" کے ت سے پہلے ہی ال سے مل جاتا ہے۔ چنانچہ اس ترکیب کو "فل فور" بولتے ہیں۔ مراد کہنے کی یہ ہے کہ عربی کی آوازوں کو مشدد (شمسی) اور غیر مشدد (قمری) کی دو قسموں میں شروع ہی سے بانٹ دیا گیا ہے لیکن اردو اور اس کی پڑوسی بولیوں میں اس سے کچھ مختلف کیفیت ملتی ہے اور ان میں اس قسم کی کوئی بانٹ نہیں ہے۔

اردو میں تشدید کے چند اصول ہیں جو نیچے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱)۔ ڑ ، ڑھ ، ء ، ہمزہ اور حلقی نون (ں) کبھی مشدد نہیں بولے جاتے اور اگرچہ و اور ی کے حروف پر تشدید کا نشان ڈال دیا جاتا ہے لیکن تشدید بولی نہیں جاتی۔ چنانچہ کوّا کو "کوآ" اور میّا کو "میآ" بولتے ہیں۔

(۲)۔ ڑ اور ڑھ کی جگہ ڈ اور ڈھ کو مشدد بولتے ہیں بلکہ ڑ کی جگہ ر کو بھی مشدد بول لیتے ہیں جیسے بڈّی باڈّی۔ پنجابی گڈّی اور اردو گاڑی۔ چڈّی چڑّی۔ گڈّھا گڑھا۔ کرّا کڑا۔ ہتری سڑی وغیرہ۔

(۳)۔ مشدد اسر سے پہلے کا سر ہمیشہ چھوٹا ہو جاتا ہے یعنی جب کسی اسر کو مشدد بولا ہوتا ہے تو اس سے پہلے کے سر کو مختصر کر لیتے ہیں اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہے جیسے تجّن (ساجن)۔ بجّا (باجا)۔ برّد (بارا)۔ چدّر (چادر)۔ دلّان (دالان)۔ لیکن سہارن پور اور مظفر نگر میں طویل سر کے بعد بھی تشدید بولتے ہیں جیسے گوڈّا (گوڈا)۔ لوٹّا (لوٹا)۔ روٹّی (روٹی)۔ آٹّا (آٹا)۔ بھائّی (بھائی) وغیرہ۔

(۴)۔ تشدید سے پہلے خفیف سنائی نہیں دیتا کیونکہ سر کے مختصر ہو جانے کے باعث خفیف بول چال سے ساقط ہو جاتا ہے۔

(۵)۔ مشدد اسر سے پہلے صرف تین مختصر سر سنائی دیتے ہیں جنہیں تحریر میں زبر، زیر اور پیش کی حرکات سے ظاہر کرتے ہیں جیسے تپّا ، اچّھا ، رکّھا ، پِلّی ، گھلّا ، کٹّی۔

(۶)۔ تشدید میں ہلکا اسر (الپ پران) دو بار بولا جاتا ہے جیسے کپّا ، مکّی ، چار کھنڈ ، کھدّر ، تکّا ، پکّ کا لیکن بھاری اسر (مہاپران) کی تشدید میں پہلی بار اس کی نوع کا ہلکا اسر (الپ پران) اور پھر دوسری بار بھاری (مہاپران) بولتے ہیں۔ جیسے اچّھا ، اچّھا ، بھتّر ، ہتّر ، کھّ ، کھّا۔

چوتھا باب

لفظیات

ہم یہ بات پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ کئی کئی آوازیں ملنے سے ایک لفظ بنتا ہے اور لفظ ہی زبان ہے کیونکہ معنویت جو زبان کی جان اور پہچان ہے لفظ سے شروع اور لفظ پر ہی ختم ہوتی ہے یعنی زبان نہ لفظ سے زیادہ ہے نہ کم۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ جس طرح کئی کئی آوازوں سے ایک لفظ بنتا ہے اسی طرح کئی کئی لفظوں سے ایسی اور کوئی لسانی اکائی نہیں بنتی جسے لفظوں کے مقابلے میں وہی حیثیت حاصل ہو جو آوازوں کے مقابلے میں لفظ کو حاصل ہے البتہ ایک لفظ سے دوسرا لفظ بن جاتا ہے۔ چنانچہ آوازوں سے لفظ کا بننا زبان کی تخلیق یا اس کا وجود میں آنا ہے اور لفظ سے لفظ کا بننا زبان کی توسیع یا اس کا پھیلاؤ یا ارتقا کہا جا سکتا ہے اور تخلیق اور توسیع میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔

رکن

لفظ چاہے آوازوں سے براہ راست بنایا گیا ہو چاہے کسی دوسرے لفظ سے تراشا گیا ہو دونوں حال میں اس کی مقدار کا تعین ضرور کیا گیا ہے جس کا پیمانہ رکن کہلاتا ہے۔ یہی کلام کی مختصر ترین اکائی ہے۔ اسے انگریزی میں سلیبل (Syllable) اور اردو میں ٹک کہتے ہیں[1]۔ دنیا کی تمام زبانوں میں رکن کی مختصر ترین مقدار اس س یا اس ا ہوتی ہے جس میں الف سے اسر اور س سے مختصر سر مراد ہے۔ اردو زبان میں اس کی چار مقداریں اور آٹھ ترکیبیں ہوتی ہیں جن کی تفصیل نیچے درج کی جاتی ہے۔

نمبر شمار	ترکیب	مقدار	مثال	معنی
۱	الف	اس ا	چل	حرکت کر، شروع کر
	ب	اس س	جا	روانہ ہو

۱۔ جنرل فونیٹکس ص ۱۹۰۔

نمبر شمار	ترکیب	مقدار	مثال	معنی
۲	الف	اس س ا	چال	رفتار
	ب	اس اا	مند	سست، آہستہ
۳	الف	اس اس ا	چلن	رسم و دستور
	ب	اس اس س	چلا	حرکت کی
۴	الف	اس اس س ا	چلان	حرکت دینے کا کام
	ب	اس اس اا	چلنت	چلنے کا ڈھنگ

مندرجہ بالا نقشے کے مطابق ہر رکن (ٹک) اسر سے شروع ہوتا ہے اور اسر یا طویل سر پر ختم ہوتا ہے اور چونکہ ارکان (ٹکوں) کے ملنے سے ہی لفظ بنتا ہے اس لئے آوازوں کی یہی پابندی لفظ کی ساخت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اردو اور اس کی معاصر زبانوں میں فارسی، عربی اور سنسکرت کے برعکس کوئی رکن یا لفظ مختصر سر پر ختم نہیں ہوتا اور فیجی کی زبان میں کوئی رکن اسر پر ختم نہیں ہوتا[1]۔

اردو میں جس اسر کے بعد سر آتا ہے اسے متحرک (چل) کہتے ہیں اور جس کے بعد سر نہیں آتا اسے ساکن (اچل) بولتے ہیں یعنی کسی اسر کی حرکت اور سکون اس کے بعد سر کے آنے اور نہ آنے کا نام ہے۔ ارکان کی مندرجہ بالا فہرست سے ظاہر ہے کہ قسم الف کی تمام ترکیبوں کے تمام آخری اسر ساکن ہیں اور ۲ب اور ۴ب کا ماقبل آخر اسر بھی ساکن ہے جو ان مثالوں میں ن ہے۔ اس استثنا میں ان کے ساتھ تھوڑے ل اور س بھی شریک ہیں جیسے مونج، اسر، یں، پریت، اورت، مدرس۔ (چیز) بست، دست (پھلّا یا فولاد)۔ جست۔ کسٹ (سنسکرت کشٹ، دکھ)۔ گرہست، الست (اٹل)۔ سنکلپ، سلپ وغیرہ۔ اردو میں ہجے کرتے وقت ان الفاظ کے آخری اسر کو موقوف بولتے ہیں۔

لہجہ

اردو کا ہر لفظ کم سے کم ایک رکن اور زیادہ سے زیادہ تین ارکان پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی ہماری زبان میں تین ارکان سے زیادہ کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ اگر لفظ سازی میں کسی لفظ کے رکن تین سے زیادہ بھی ہو جاتے ہیں تو انھیں مختصر کر کے تین ارکان تک لے آتے ہیں اور مختصر کرنے کی اس کوشش میں سر کچل دیئے جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اردو کا لہجہ انحصار کی طرف مائل ہے جس کا ثبوت یہ

۱۔ جنرل فونیٹکس ص ۴۲

ہے کہ تین تو تین دو ارکان سے بننے والے الفاظ بھی چھوٹے کر دئے جاتے ہیں اور سر گھٹا کر بولے جاتے ہیں۔ یہ بات مرکبات سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً گپ شپ (دو ارکان)۔ بانگ ٹوٹ (دو ارکان)۔ ہتھ چھٹ (دو ارکان)۔ ہاتھ چھوٹ (دو ارکان)۔ پچ میل (دو ارکان)۔ پانچ میلی (دو ارکان)۔ نک چٹکی (تین ارکان)۔ ناک چھینکی (تین ارکان)۔ نک گھسن (تین ارکان)۔ ناک گھسنی (تین ارکان)۔ پن کٹا (تین ارکان)۔ پان کوٹی (تین ارکان)۔ گھس کھدا (دو ارکان)۔ گھاس کھودا (تین ارکان)۔ پتھر چٹ (دو ارکان)۔ پتھر چاٹ (تین ارکان)۔ پن ڈبی (تین ارکان)۔ پانی ڈبی (چار ارکان) وغیرہ۔

تین ارکان سے بڑھ جانے والے مفرد الفاظ کی مثالیں یہ ہیں:

کلکتیا (کل + کتی + آ، تین ارکان) = کلکتہ + ایا۔ کل + کت + تہ + ایا (چار ارکان بمعنی کلکتے کا)۔

چلویا (چل + وئی + آ، تین ارکان) = چلوائی + آ = چل + وا + ئی + آ (چار ارکان بمعنی چلوانے والا)۔

پسرٹا (پس + رٹ + ٹا، تین ارکان)۔ پنسار + ٹا یا ہٹا = پن + سار + ہٹ + ٹا (چار ارکان بمعنی پنسار کا بازار)۔

بھلمنسہٹ (بھل + من + سٹ (آہٹ)، تین ارکان)۔ بھلا + مانس + آٹ یا آہٹ = بھلا + ا + نس + آٹ یا آہٹ (چار ارکان بمعنی انسان کی اچھائی)۔

لفظ سازی

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے دنیا کی ہر زبان میں لفظ سازی کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ آوازوں سے لفظ بنانا جسے زبان کی تخلیق یا ایجاد کہہ سکتے ہیں اور اس طرح جو چھوٹے سے چھوٹا لفظ بنتا ہے اسے جڑ، مادہ یا اساس کہتے ہیں جیسے ہاتھ، پکھ، تیر وغیرہ۔

۲۔ لفظ سے لفظ بنانا جسے زبان کی توسیع کہا جا سکتا ہے جیسے ہتھڑ، پرکھائی، تیراک وغیرہ جو ہاتھ، پکھ، تیر کی جڑوں، مادوں یا اساسوں سے بنے ہیں۔

ان جڑوں کو نکاس بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان سے دوسرے لفظ نکلتے ہیں لیکن پھر ان سے نکلنے والے لفظوں سے بھی مزید دوسرے الفاظ مثلاً ہتھڑا، پرکھیا اور تیراکی بن جاتے ہیں اور اس طرح ہتھڑ، پرکھائی، تیراک خود بھی دوسرے لفظوں کا نکاس ٹھیرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس لفظ سے دوسرا لفظ نکلتا ہے اسے نکاس اور جو لفظ نکلتا ہے اسے نکاسی کہنا چاہئے۔ اس طرح نکاس میں تو وہ

تمام الفاظ شامل ہیں جو چاہے براہ راست آوازوں سے بنے ہوں اور چاہے دوسرے لفظوں سے گھڑے گئے ہوں لیکن نکاسی میں صرف انھیں لفظوں کا شمار ہوگا جو دوسرے لفظوں سے بنے ہیں۔

بناوٹ کے لحاظ سے الفاظ کی مندرجہ ذیل قسمیں کی جا سکتی ہیں:

۱۔ وہ الفاظ جو دوسرے لفظوں سے نہیں بنے۔ یہ وہ ابتدائی الفاظ ہیں جو پہلی بار براہ راست آوازوں سے بنے ہیں۔ ان کی پھر دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔

الف۔ مصدر یا نکاس: وہ ابتدائی الفاظ جن سے دوسرے لفظ بنتے ہیں انھیں مادہ کہتے ہیں۔ جیسے آ (آو، آتا، آیا)۔ چل (چلا، چلن، چلنا، چلاو، چلیا)۔ پیٹ (پیٹا، پیٹی، پیٹو، پٹکیا، پیٹیا) وغیرہ۔

ب۔ جامد: وہ ابتدائی الفاظ جن سے دوسرے لفظ نہیں بنتے۔ (عوامل) میں۔ سے۔ تک۔ پر۔ کو۔ لے۔ (حروف) اور۔ کہ وغیرہ۔

۲۔ مشتق یا نکاسی: وہ الفاظ جو دوسرے لفظوں سے بنے ہیں جیسے پڑھائی (پڑھ سے)۔ چلن (چل سے)۔ پیراک (پیر سے)۔ پیٹو (پیٹ سے)۔ چمڑی (چام سے)۔

جس طرح زبان کی پیدائش کا حال جاننے کے لئے ذہن انسانی نے اب تک جتنی کوششیں کی ہیں وہ سب کی سب ناکام رہی ہیں اور بالآخر ماہرین لسانیات نے تھک ہار کر اس کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے اسی طرح اس حقیقت کے بارے میں بھی کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا لفظ جسے جڑ یا مادہ کہتے ہیں کس طرح وجود میں آیا، یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس موضوع کا زیادہ تر تعلق معنی سے ہے اس لئے اگلے باب "معنویات" میں اس پر کچھ اظہار خیال کیا جا سکے گا البتہ موجودہ باب میں لفظ سے لفظ بنانے کے طریقوں پر غور کیا جائے گا۔

اس مقام پر یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اردو بول چال میں ایک لفظ ایک بار بھی استعمال ہوتا ہے اور دو دو بار بھی بولا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ کم سے کم دو مختلف لفظ ملا کر بھی بولے جاتے ہیں۔ ان اشکال کو مفردات، مکررات اور مرکبات کہتے ہیں۔ سطور آئندہ میں لفظ کا بیان اسی ترتیب سے کیا جائے گا۔

مفردات:

جس طرح نقطے سے خط، مرکز سے دائرہ اور بیج سے درخت بنتا ہے اسی طرح مختصر ترین لفظ

(iii) اسم کا طول جیسے بجھڑنا بچھڑنا، بچھڑنا بچھیرنا، پلنا پیلنا، گھرنا گھیرنا، پھرنا پھیرنا، پٹنا پیٹنا، پسنا پیسنا، مرنا مارنا، کٹنا کاٹنا، ڈھلنا ڈھالنا، بندھنا باندھنا، لٹنا لوٹنا، چھٹنا چھوٹنا، رکنا روکنا، گھٹنا گھونٹنا۔

۲۔ اسم (ل) کا اضافہ:

(i)۔ سینا سِلنا، دینا دِلنا، دھونا دُھلنا، دھونا دُھلنا، چھونا چھِلنا۔

(ii)۔ سونا سُلانا، جینا جِلانا، کھانا کھلانا، پینا پلانا، رونا رُلانا، چھونا چھُلانا، دھونا دھلانا، دینا دلانا، سینا سلانا۔

۳۔ مرکب صوتی تبادل:

چھوٹنا چھوڑنا، ٹوٹنا توڑنا، پھوٹنا پھوڑنا۔

۴۔ نظیر

یہ طریقہ پچھلے طریقوں پر حاوی اور غالب ہے۔ سب کا جامع ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ثمرے سے استفادہ کرتا ہے۔ یہ ایک لفظ سامنے رکھ کر اس کے انداز پر دوسرا لفظ بناتا ہے۔ کسی لفظ کی بناوٹ میں کوئی سا اصول کیوں نہ برتا گیا ہو جب اس کو سامنے رکھ کر اسی کے ڈھنگ پر دوسرا لفظ ڈھالا جائے گا تو اس میں بھی وہ اصول یقیناً منتقل ہو جائیں گے جو نظیر میں برتے گئے ہیں۔ اس طرح لفظ سازی میں یہ ضروری نہیں ہو گا کہ پہلے کوئی لفظ سازی کے اصول پہچانے اور پھر انھیں استعمال کرے۔ اس طریقے سے لفظ سازی میں محنت اور وقت دونوں کی بچت ہوتی ہے اور کام بھی حسب منشا تکمیل پاتا ہے۔

وینڈریسے کہتا ہے کہ نظیر درحقیقت تمام لفظیات کی اساس ہے۔ ماہرین لسانیات نے نظیر کو الجبرا کے متناسب کلیے کی شکل میں یوں پیش کیا ہے۔

الف : ب :: ج : ا

یعنی الف کو ب سے جو نسبت ہے وہی ج کو ا (نامعلوم مقدار یعنی نظیر یافتہ لفظ) سے ہوتی ہے۔[1]

زبانوں میں بیشتر یہی ہوتا ہے کہ موجود لفظ سامنے رکھ کر نئے نئے لفظ بنائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ سازی کے اصول یکساں طور پر عوام الناس کی دسترس میں نہیں ہوتے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہو گا کہ لفظ سازی کے وقت علی العموم بولنے والوں کے سامنے اصول نہیں لفظ ہوتے

1. لینگویج ص ۱۹۰۔

ہیں۔ ان بولنے والوں میں جو نئے نئے لفظ گھڑتے ہیں عام اور عامی سبھی شامل ہیں۔ چنانچہ بیشتر الفاظ نظیروں پر ہی بنائے جاتے ہیں البتہ یہ بات قبول عام پر منحصر ہے کہ کون کون سے نئے الفاظ ذخیرۂ زبان میں شامل کئے جاتے ہیں۔ بعض الفاظ سکۂ رائج الوقت کی طرح چلن پا جاتے ہیں اور بعض کھوٹے سکوں کی طرح قبول عام سے محروم رہ کر مسترد ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ یا وسیلہ اور کوئی ایسا آلہ یا پیمانہ نہیں ہے جس کی مدد سے یہ بتایا جا سکے کہ زبان کے ذخیرے میں کون کون سے الفاظ اصول سامنے رکھ کر گھڑے گئے ہیں اور کون سے لفظ صرف نظیروں پر ڈھالے گئے ہیں۔

ہمارے یہاں اب تک جو لفظ بنائے گئے ہیں وہ مختلف اور متنوع اصولوں کے تحت بنے ہیں۔ بولنے والے ان میں سے کوئی سا لفظ سامنے رکھ کر نیا لفظ گھڑ سکتے ہیں۔ مثلاً "آو" کے لاحقے والے جو ڈھنگ اور کیفیت کے معنی میں لگایا جاتا ہے بہت سے لفظ ہمارے استعمال میں آ رہے ہیں جیسے بناو، سجاو، بچاو، برتاو، جماو وغیرہ۔ اگر کوئی شخص ان کی مدد سے مزید لفظ بنانا چاہے تو بنا سکتا ہے جیسے لکھ سے لکھاو (لکھنے کا انداز)، پڑھ سے پڑھاو (پڑھنے کا انداز) اور دیکھ سے دکھاو (دیکھنے کا انداز) وغیرہ لیکن کیفیت اور انداز کے معنوں میں لکھ سے لکھت اور لکھائی، پڑھ سے پڑھت، پڑھنت اور پڑھائی اور دیکھ سے دیکھن کے الفاظ پہلے ہی سے عوام میں رائج ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان معنوں میں لکھ، پڑھ اور دیکھ سے لفظ بناتے وقت دوسری نظیریں سامنے رہی ہیں۔

نظیروں سے لفظ سازی میں بعض اوقات کھوٹے سکے ڈھالنے کا بھی خدشہ رہتا ہے جس کی وجہ ہمارے غور و فکر کی کمی ہو سکتی ہے۔ مثلاً انھیں الفاظ کے سلسلے میں جن کا ذکر ابھی ہوا ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں معنوں میں لاحقہ "آو" پر بظاہر ایک الف کے معنوی اضافے سے بھی الفاظ بنتے ہیں جیسے پہناوا، بلاوا، دکھاوا، بچھاوا وغیرہ لیکن ان میں سے کوئی لفظ "آو" پر ختم نہیں ہوا یعنی پہناو، بلاو، دکھاو، بچھاو وغیرہ الفاظ نہیں بولے جاتے۔ بعض الفاظ صرف "آو" سے بنے ہیں اور "آوا" سے نہیں بنائے گئے جیسے ٹھیراو، گھراو، بہکاو، کھچاو، کٹاو وغیرہ یعنی ان معنوں میں ٹھیراوا، گھراوا، بہکاوا، کھچاوا، کٹاوا وغیرہ جیسے روپ نہیں بولے جاتے۔ کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جن کے جوڑے ملتے ہیں یعنی ان کا ایک روپ "آو" سے بنا ہے اور دوسرا "آوا" سے اور معنی میں بظاہر کوئی فرق بھی نظر نہیں آتا جیسے برتاو اور برتاوا، پچھتاو اور پچھتاوا، بچھاو اور بچھاوا وغیرہ لیکن بعض بعض الفاظ کے دونوں روپوں میں معنوی اختلاف بھی ملتا ہے جیسے چڑھاو (بلندی) اور چڑھاوا (نذرانہ، قربانی)۔

متذکرہ بالا مثالوں میں اس گڑبڑ کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں دو اصول یک جا ہو گئے

ہیں۔ ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ اردو زبان کا داخلی اصول یہ ہے کہ فعلی مادوں پر "آو" کا لاحقہ بڑھانے سے انداز اور کیفیت کے معنی دینے والا اسم بن جاتا ہے۔ مثلاً:

بہہ (نا) سے بہاو، بن (نا) سے بناو، جم (نا) سے جماو، رک (نا) سے رکاو، جھک (نا) سے جھکاو، کھنچ (نا) سے کھنچاو وغیرہ۔ اب اگر "آو" اور "آوا" دونوں ہی متبادل لاحقے ہیں تو ان میں سے ایک یعنی پہلا [آو] اردو کا اور دوسرا [آوا] باہر کا ہو گا کیونکہ اردو کا فطری لہجہ اختصار کی طرف مائل رہتا ہے۔ طویل لاحقے اردو میں دخیل رجحان کا پتا دیتے ہیں۔ لفظوں کے اکہرے دوہرے روپوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ صاف صاف دو واضح ذخیروں کی ملکیت ہیں۔ مختصر روپ اس [اردو] زبان کی ملکیت ہیں جس کا لہجہ اختصار پسند ہے اور طویل روپ اس زبان سے آئے ہیں جس کے لہجے میں نسبتاً طوالت پسندی پائی جاتی ہے اور وہ اس خصوصی معاملے میں میرے خیال سے مرہٹی ہو سکتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں رجحانات ایک عرصہ دراز تک بالکل قریب قریب جاری رہے ہیں جس کے باعث اب آکر ہمارے یہاں ایک ہی لفظ کے دو دو روپ (ایک مختصر اور دوسرا طویل) بن کر رائج ہو گئے ہیں۔ نظیروں سے لفظ بنانے میں ہوش مندی اسی لئے ضروری ہوتی ہے کہ ہم اپنی زبان کا رجحان چھوڑ کر دخیل رجحان کی پیروی نہ کرنے لگیں۔

الفاظ چاہے براہ راست اصول سامنے رکھ کر بنائے گئے ہوں چاہے نظیروں پر ڈھالے گئے ہوں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ لفظ سازی کے وقت ایک اصول کے نمونے سامنے کیوں رکھے گئے اور دوسرے اصول کے نمونے کیوں ترک کر دیے گئے۔ مثلاً بگڑنا سے بگاڑنا بنایا لیکن بگیڑنا نہیں بنایا۔ اس کے خلاف بکھرنا سے بکھیرنا بنایا بکھارنا نہیں بنایا۔ اسی طرح ادھڑنا سے ادھیڑنا تو بنایا ادھاڑنا نہیں بنایا جبکہ اس کے برعکس اکھڑنا سے اکھیڑنا کے ساتھ ساتھ اکھاڑنا بھی بنا لیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج جو روپ نظر نہیں آ رہے ہیں وہ کبھی بنے ہوں لیکن چالو نہ ہو سکے ہوں۔ اگر ایسا ہوا ہے تو اس کی وجہ کیا ہوئی؟ اس کے بارے میں آج حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے روپوں کی ضرورت ہی نہ پڑی ہو یا ان کی طرف دھیان ہی نہ گیا ہو اس لئے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کام اب تک نہیں ہوا ہے وہ آئندہ بھی نہ ہو۔

تکرارات:

ہمارے یہاں جس طرح ایک آواز کو دو دو بار بولنے کا چلن ملتا ہے (جسے تشدید کہتے ہیں)

اسی طرح ایک لفظ کو بھی دو دو بار بولتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے تشدید آریائی زبانوں میں نہیں ملتی صرف عربی (سامی) اور ہندوستانی زبانوں میں سنائی دیتی ہے لیکن ایک ایک لفظ دو دو بار بولنے کی ریت تو عربی میں بھی نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف ہندوستانی زبانوں ہی کا خاصہ ہے اور بہت عام ہے۔ ہماری زبان میں لفظ کو دہرانے کے کئی مقصد ہوتے ہیں۔

الف۔ تنکیر اور جامعیت:

مثالیں: رشتے داروں میں گھر گھر بلاوا بھیجا تھا پھر بھی شادی میں لوگ کم آئے۔

وہ بات بات پر ناخوش ہو جاتا ہے۔

ب۔ کثرت اور شدت:

مثالیں: مسخرے کی باتوں پر لوگ ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔

میں چلتے چلتے تھک گیا۔

وہ آج کل چپ چاپ رہتا ہے۔

ج۔ زور اور تاکید:

مثالیں: دھیرے دھیرے چلو۔

چھوٹا چھوٹا نوالہ کھاؤ۔

وہ رات رات بھر گھر سے غائب رہتا ہے۔

انھوں نے ایک ایک پیالی چائے میں دو دو چمچے شکر ڈالی۔

د۔ حصر اور تخصیص:

مثالیں: بچوں بچوں میں لڑائی ہو تو بڑوں کو نہیں بولنا چاہئے۔

دن دن میں منزل پر پہنچ جاؤ تو اچھا ہے۔

بیٹھے بیٹھے کام نہیں چلتا۔

کبھی لفظ کے دہرانے سے پہلے بیچ میں مندرجہ ذیل آوازوں کا اضافہ کر دیتے ہیں جنھیں بچولے کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ برابر (بار بار، لگاتار، ہمیشہ)، پٹاپٹ، تراتر، ٹیکاٹیک، چٹاچٹ، چلاچل، چکاچک، جھکاجھک، بھگابھگ، دمادم، دھڑادھڑ، دھواں دھوں، ملاملت، کھٹاکھٹ، مارامار، سناسن۔

بِل: چَل بَچَل، دُوس بدوس، رات برات، رنگ برنگ۔

آم: بھاگم بھاگ، مارم مار، خونم خون۔

اُوں: ایکوں ایک، آدھوں آدھ، بیچوں بیچ، ناکوں ناک، دھاروں دھار، راتوں رات، کانوں کان، لالوں لال، ناکوں ناک، ہاتھوں ہاتھ۔

کبھی الفاظ کے دہرانے سے پہلے اور بعد میں بھی کچھ آوازوں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ انھیں متوازن مکررات کہہ سکتے ہیں۔ مثالیں یہ ہیں:

آ۔ اِی: بدابدی، بھلا بھلی، جماجمی، چلاچلی، دیکھا دیکھی، سراسری، شوراشوری، کھڑا کھڑی، کھلا کھلی، ہراہری۔

اَم۔ آ: اودھم اودھا، دھکم دھکا، صفم صفا، گتھم گتھا، لٹھم لٹھا۔

مرکبات:

دو مختلف الفاظ کے مجموعے کو مرکب کہتے ہیں جیسے کام چور، منہ بولا، کن کٹا وغیرہ لیکن کبھی مرکب کے دونوں الفاظ معنی دار ہوتے ہیں اور کبھی ایک معنی دار اور دوسرا بے معنی یا مہمل ہوتا ہے۔ اس طرح معنی کے لحاظ سے مرکب کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔

۱۔ مکمل معنی دار۔ وہ مرکب ہے جس کے دونوں لفظ معنی دار ہوتے ہیں۔

۲۔ جزوی معنی دار۔ وہ مرکب ہے جس کا ایک لفظ معنی دار اور دوسرا بے معنی یا مہمل ہوتا ہے۔

ان میں سے ہر ایک کی پھر تین تین قسمیں ہو جاتی ہیں۔

۱۔ مختلف الفاظ کا مجموعہ جسے سادہ کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ ہم وزن الفاظ کا مجموعہ جسے متوازن کہہ سکتے ہیں۔

۳۔ ہم قافیہ الفاظ کا مجموعہ جسے مقفیٰ کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ مکمل معنی دار

اس قسم کے مرکب میں دونوں الفاظ کے مابین مساوی یا غیر مساوی کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہوتا ہے۔ ذیل میں اس کی تفصیلات مع امثلہ بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ عطفی: یہ مرکب معطوف اور معطوف علیہ سے مل کر بنتا ہے۔ اس میں دونوں الفاظ کی حیثیت برابر ہوتی ہے اور ایک لفظ دوسرے پر محض اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ دونوں الفاظ کے درمیان "یا" اور "اور" بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس میں معنی کے لحاظ سے لفظوں کی کئی حیثیتیں ہو جاتی ہیں۔ مثالیں یہ ہیں:

مترادف یا متحد المعنی یا ہم معنی۔ سڑی بولا، چونا چکلا، بالا بولا، ٹکیل پلو، دواتی جناتی، گورا چٹا، کھیا بابا، اٹھا متا، گاؤں گراؤں، چکنا چپڑا، گھس پٹا، لیپن پوتی۔

قریب المعنی۔ لڑائی جھگڑا، لڑکا بالا، ہتا پوتی، ٹھونک پیٹ، دیکھ بھال، جان پہچان، جانچ پرکھ، توڑ پھوڑ، چیخ پکار، کام کاج، مل جل، کھوٹ کسر۔

مختلف المعنی۔ آگ بگولا، مول تول، ناپ تول، ملاپ کانا، ہتھ چوری، رنگ ڈھنگ، پھول پان، چھان بین، جھاڑ پونچھ، رنگ روپ، جڑی بوٹی، تل چاولی، روٹی کپڑا، گھیرا گھیری۔

متضاد۔ الٹا سیدھا، اوندھا سیدھا، باہر بھیتر، جھوٹ سچ، اونچ نیچ، ہار جیت، اتار چڑھاؤ، لین دین، اگاڑی پچھاڑی، کھانا پانا، اتھل پتھل، اگاڑی پچھاڑی، رات دن، اوپر نیچے، اگلا پچھلا۔

۲۔ تشبیہی: یہ مرکب مشبہ اور مشبہ بہ سے مل کر بنتا ہے۔ اس مرکب میں دونوں لفظوں کے درمیان تشبیہ کا تعلق ہوتا ہے جیسے:

جھاڑو تارا (جھاڑو جیسا تارا)۔ اکل ڈاڑھ (آنکل یا آگل جیسی روکنے والی)۔ پہاڑ رات (پہاڑ جیسی سخت کٹنے والی رات)۔ سورج مکھی (سورج کا سا چہرہ رکھنے والی)۔ چندر مکھی (ایضاً)۔

۳۔ اضافی: یہ مرکب مضاف اور مضاف الیہ سے مل کر بنتا ہے۔ اس مرکب کے دونوں لفظوں کا درمیانی تعلق "کا، کی، کے" سے ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے:

سبزی منڈی (سبزی کی منڈی)۔ گھڑ دوڑ۔ کن میلیا۔ ہاتھی دانت۔ چھت چور۔ لوہ چون (لوہے کا برادا)۔ جیب گھڑی۔ چاند گہن۔ ہتھ کڑی۔ بندر بانٹ۔ پن گھٹ۔ جان جوکھوں۔ کنڑ تیلی۔

۴۔ نسبتی: یہ مرکب منسوب اور منسوب الیہ سے مل کر بنتا ہے۔ اس میں ایک لفظ کو دوسرے لفظ کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیسے:

گھر جنوائی۔ بن مانس۔ گل گچھا۔ دوپہریا پھول۔ دوپہریا بھوت۔ ہتھ گولا۔ جل کوا۔ بن بلی۔ بن بکلی۔ بن ڈبی۔ کوڑی پھیرا۔ کن رسیا۔ مچھ کٹ۔ گل بیاں۔ جنگل۔ شتر ال۔

(۴)۔ بعض مثالوں میں دونوں الفاظ مختلف لیکن ہم وزن ہوتے ہیں۔ جیسے:

پٹیک بیٹیا، تنگی ترشی، توبہ تلا، بیماری داعتداری، مان گون، ٹکرا تیار۔

(۵)۔ بعض مرکبات میں پہلے لفظ کے بعد "ا" اور دوسرے کے بعد "ی" لگا کر تانیث بڑھا کر جزو کلیت کے معنی دے دیے گئے ہیں۔ جیسے:

بوندا باندی، روٹھا روٹھی، روکا راکی۔

مہمل: ان مرکبات میں ایک لفظ معنی دار اور دوسرا مہمل لیکن اس کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ مہمل لفظ کبھی معنی دار لفظ سے پہلے آتے ہیں اور کبھی بعد میں۔ پہلے آنے والوں کو اردو میں اگوا اور بعد میں آنے والوں کو پچھوا کہتے ہیں اور یہ مختلف آوازوں سے بنائے جاتے ہیں۔ ان کی الگ الگ تفصیل مع امثلہ درج کی جاتی ہے۔

اگوے

۱۔ ہمزہ سے شروع ہونے والے جیسے:

آر پار، آس پاس، آلتی پالتی، آمنا سامنا، آن بان، الٹوائی کھٹوائی، آمنے سامنے، انجر پنجر، انگڑ کھنگڑ، ادلا بدلا، اڑوس پڑوس، اٹل جٹل، الا بلا، الٹے کلٹے، ای جی، آئیں بائیں۔

۲۔ ہائے ہوز سے شروع ہونے والے جیسے:

ہڑ بڑ، ہیر پھیر، ہچکچانا، ہڑبڑانا، ہرج مرج، ہشت مشت، ہک دک، ہٹا کٹا، ہکا بکا، ہلن چلن۔

پچھوے

۱۔ ب سے شروع ہونے والے جیسے:

ترتی برتی، ٹیڑھی بیڑھی، ٹھلے بھلے، ٹھاٹ باٹ، چھل بل، میڑا بیڑا، ہکل بکل، کھد بد، کھد بد، کھڑ بڑ، گھل بل، گڈ بڈ، گڑ بڑ، گڑبد، ٹھاٹ باٹ۔

۲۔ پ سے شروع ہونے والے جیسے:

اٹکل پچو، اوبڑ پوبڑ، الجھا پلجھا، جھٹ پٹ، چٹ پٹ، دھڑا پڑا، سٹر پٹر، لشتم پشتم (شتم پشتم، لشتم پشتم)، کھٹ پٹ، کٹ پٹ، لت پت، لٹ پٹ، لوٹ پوٹ، لوٹنا پوٹنا، گچ پچ، گھس پس۔

۳۔ ٹھ سے شروع ہونے والے جیسے:

بنا ٹھنا، بھول ٹھول، کٹا ٹھٹا، میلا ٹھیلا۔

۴۔ د سے شروع ہونے والے جیسے:

پکڑ دھکڑ، پرانا دھرانا، روتا دھوتا، کام دھام، کرنا دھرنا، کھانا دھانا، مار دھاڑ۔

۵۔ س سے شروع ہونے والے جیسے:

آٹا ساٹا، ادھار سدھار، الٹا سلٹا، الاپ سلاپ (شتاپ)، اٹ سٹ (شٹ)، دبا سا، ٹھیک سیک، غلط سلط، گپ سپ (گپ شپ)، گٹ سٹ، گم سم، گندا سندا، لونڈ سونڈ، ہوتے سوتے۔

۶۔ م سے شروع ہونے والے جیسے:

ترمرا، جھلملانا، جگ مگ، جگر مگر، جگمگانا، جھک مک، جھل مل، جھلملانا، جھوٹ موٹ، چکر مکر، چھوٹا موٹا، دھوم دھام، ڈگ مگ، ڈگمگانا، ڈھل مل، ڈھلملانا، ریچ میچ، کس مسانا، گڈ مڈ، گھونٹ موٹ، پل مل۔

۷۔ و سے شروع ہونے والے جیسے:

پانی وانی، روٹی ووٹی، کپڑا وپڑا، کتاب وتاب، قلم ولم، کھانا وانا۔

پانچواں باب

معنویات

پچھلے باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ زبان بیانِ کائنات کے لئے ایجاد ہوئی ہے اور یہ بیان کائنات کے حیاتی اور مادی دونوں پہلوؤں یعنی انسان کی داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں کو محیط ہے۔ انسان اپنی خارجی دنیا کو جس نظر سے دیکھتا ہے اور جیسا پاتا ہے اور پھر اس کا جو رد عمل اپنی داخلی دنیا میں محسوس کرتا ہے وہ سب کچھ اس نے الفاظ میں بھر دیا ہے اور برابر بھرتا رہتا ہے۔ گویا کائنات ایک سمندر ہے اور زبان ایک کوزہ ہے اور کائنات کا سمندر زبان کے کوزے میں سمویا ہوا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ زبان کائنات کے لئے اور لفظ معنی کے لئے بنا ہے۔ ہم لفظ کے لئے معنی تلاش کرنے نہیں جاتے بلکہ معنی کے لئے لفظ گھڑتے ہیں۔ معنی کی یہ اولیت اور لفظ کی ثانویت یعنی لفظ پر معنی کی فوقیت ایک ایسی ناقابلِ تردید حقیقت ہے جو ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے۔

معنی کی حقیقت:

آخر معنی کسے کہتے ہیں؟ معنی کی تعریف کیا ہے؟ اوگڈن اور رچرڈس نے اپنی کتاب میں جو پہلی بار ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی اس لفظ کی ۲۲ تعریفیں بیان کی ہیں[1]۔ ان کے پیش کرنے سے انھیں یہ بتانا مقصود تھا کہ معنی جیسے بنیادی لفظوں پر اتفاقِ رائے نہ ہونے سے کتنی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔

اس پر جیوفرے لیچ نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان مصنفین نے جو ۲۲ تعریفیں دی ہیں ان میں سے بیشتر تعریفیں مصنفین کے الفاظ میں فلسفیوں، نفسیات دانوں، لسانی ماہروں، ادبی نقادوں اور دوسرے متخصصین کی قرار تعریفیں ہیں اور ان میں باہمی تناقض اس لئے پایا جاتا ہے کہ ہر ماہر نے معنی کے مطالعے کو اپنے اپنے شعبے کی ضروریات کے مطابق ڈھالنا چاہا ہے۔ چنانچہ فلسفی سچ جھوٹ کے

ا۔ میننگ آف میننگ ص ۱۸۶، ۲۰۹۔

لحاظ سے، کرداری نفسیات داں مہیج اور رد عمل کے لحاظ سے اور ادبی نقاد اپنے قاری کے رد عمل کے لحاظ سے معنی کی تعریف کرے گا اور یہ بالکل سیدھی سی بات ہے کہ جب ان کی تعریفیں مختلف اصولوں، معیاروں اور نظریوں سے کی جائیں گی تو ان میں قدر مشترک بہت کم ہوگی[1]۔

دراصل اوگڈن اور رچرڈس کی دی ہوئی مثالوں میں ایک عام لفظ کی حیثیت سے معنی کے مختلف معنی سامنے آتے ہیں اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ آپ زبان کا کوئی سا لفظ لے لیجئے آپ دیکھئے گا کہ مختلف جملوں اور مختلف سیاق و سباق میں اس کے کتنے ہی معنی نکل آتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دکھانے کے لئے کہ ہمارے یہاں لفظ "معنی" کن کن معنوں میں استعمال ہو رہا ہے اردو کے چند جملے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
۲۔ اس کے کیا معنی کہ تم میری عیادت تک کو نہیں آئے؟
میری رعایت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں کوئی کمزوری محسوس کرتا ہوں۔
۳۔ خدا اس معنی میں رب العالمین ہے کہ وہ سب کو روزی دیتا ہے۔
آخرت میں خدا ایک معنی سے اپنا دیدار دکھائے گا۔
۴۔ افسر کی ضرورت کے سامنے ماتحت کی ضرورت کوئی معنی نہیں رکھتی۔
وطن پر ایک جان کیا معنی ہزاروں جانیں قربان کی جا سکتی ہیں۔
۵۔ صلح ہو جانے کے بعد بات نہ کرنا بے معنی ہے۔
۶۔ تمیز کے یہ معنی ہیں کہ اپنے آگے سے کھاؤ۔
۷۔ تم نے میری گفتگو سے یہ معنی کیسے نکال لئے کہ میں اس معاملے سے دستبردار ہو گیا ہوں۔
۸۔ تمہارے سیانے ہو جانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم باپ کو جواب دینے لگو۔
۹۔ ان کے آنے کے معنی یہ تھے کہ وہ صلح چاہتے ہیں۔
۱۰۔ پچاس برس کی اس تگ و دو کے کیا معنی ہیں؟
خواب میں چاند گہن دیکھنے کے کیا معنی ہیں؟
۱۱۔ ترکِ تعلق کے بعد بات کرنا بے معنی ہے۔
جب تم کسی کی سنتے ہی نہیں تو تم سے بات کرنا بے معنی ہے۔

ا۔ سیمانٹکس ص ۲۔

۱۲۔ امیر ہو جانے کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ غریبوں کو خاطر میں ہی نہ لاؤ۔

۱۳۔ وہی معنی ہیں گو دھوکا ہے صورت کے ازالے کا
اگر ژالہ ہو پانی سے دگر پانی ہو ژالے کا (امام چاند پوری)

۱۴۔ دوستی میں لڑائی کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں اور دشمنی میں کچھ اور۔

ان جملوں میں لفظ "معنی" کے جو مختلف معنی نکلتے ہیں وہ نمبروار نیچے درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ مفہوم ۲۔ وجہ، سبب ۳۔ اعتبار، لحاظ، طرح ۴۔ حیثیت، وقعت، اہمیت
۵۔ جواز ۶۔ تقاضا ۷۔ تجویز ۸۔ استحقاق
۹۔ مقصد، منشا ۱۰۔ اشارہ ۱۱۔ فائدہ ۱۲۔ امتیاز، خصوصیت، لازمہ
۱۳۔ حقیقت، ماہیت ۱۴۔ تصور، تعبیر

بہر حال اوگڈن اور رچرڈس کے گنے ہوئے یا میرے دیے ہوئے اردو بول چال کے جملے ان سے صرف کثرت معنی کی حقیقت ثابت ہوتی ہے جو دنیا کی ہر زبان کا خاصہ ہے جیسا کہ پیش نظر کتاب کے پہلے باب میں بھی بیان کیا جا چکا ہے چنانچہ اوگڈن اور رچرڈس پر یہ اعتراض درست نہیں ہے کہ ان نے مختلف ماہرین کے نقطۂ نظر سے معنی کی تعریفیں کی ہیں کیونکہ ہر لسانی سماج کے ہر طبقے میں زبان کا ہر لفظ استعمال ہوتا ہے البتہ ان پر یہ اعتراض ضرور وارد ہوتا ہے کہ انھوں نے لسانیات کے ایک علمی مسئلے کی حیثیت سے معنی کی حقیقت دکھانے یا تعریف کرنے کے بجائے اس کے مختلف استعمالات سے نکلنے والے معنوں کی مثالیں پیش کر دیں۔

اوگڈن اور رچرڈس کے دس سال بعد ۱۹۳۳ء میں بلوم فیلڈ نے کہا: "ہم کسی لفظ کے معنی کی صرف اسی وقت صحیح تعریف کر سکتے ہیں جب یہ کسی ایسے معاملے سے متعلق ہو جس کا ہم سائنٹفک علم رکھتے ہوں مثلاً ہم معدنیات کے ناموں کی علم کیمیا اور علم معدنیات کی اصطلاحات کے وسیلے سے تعریف کر سکتے ہیں جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ نمک کے لفظ کے عام معنی سوڈیم کلورائڈ ($NaCl$) ہیں اور ہم پودوں یا جانوروں کے ناموں کی تعریف نباتیات یا حیوانیات کے اصطلاحی لفظوں کے ذریعے سے کر سکتے ہیں لیکن محبت یا نفرت جیسے لفظوں کی قطعیت کے ساتھ تعریف نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ایسے حالات سے تعلق رکھتے ہیں جن کی صحت کے ساتھ درجہ بندی نہیں ہو پائی ہے اور ایسے ہی الفاظ کی تعداد زیادہ ہے۔"[1]

اس بیان پر جیوفری لیچ تین اعتراض کرتا ہے:

۱۔ لینگویج، ص ۱۳۹۔

۱۔ عام طور پر ہر وقت ایک ہی صورت حال کے کئی کئی مربوط سائنسی بیانات ملتے ہیں۔ ہم ان میں سے کس کو تعریف کے لئے منتخب کریں اور کسے چھوڑ دیں؟

۲۔ سائنس نظر ثانی اور توضیح کے مسلسل عمل سے آگے بڑھتی ہے تب جا کر اس سے فکر میں صفائی اور گہرائی آ پاتی ہے۔ چونکہ سائنسی بیانات مشروط ہوتے ہیں اس لئے اس وقت کا پہلے سے اندازہ لگانا مشکل ہے جب ہر ایک کو اتنا اطمینان نصیب ہو جائے کہ اب محبت اور نفرت جیسے لفظوں کی صحیح صحیح تعریف شروع کرنے کے لئے مزید اہم تبدیلیاں نہیں ہوں گی۔

۳۔ سائنسی کلیے کی شکل میں تعریف جیسے نمک = $NaCl$ صرف لسانی علامات کے ایک مجموعے کو دوسرے مجموعے سے بدل دیتی ہے۔ یہ مانتے ہوئے کہ روزمرہ کی ہر زبان کی طرح سائنسی زبان بھی بامعنی ہوتی ہے ہمیں $NaCl$ کے معنی بیان کرنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور اگر ہم اسے کسی اور زیادہ قطعی یا معلومات افزا کلیے سے بدل لیتے ہیں تو پھر یہی مسئلہ اس کے ساتھ بھی پیش آئے گا اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا چلا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں معنی معلوم کرنے کے لئے بلوم فیلڈ کا یہ نسخہ غیر مختتم پیمایش کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور عملی اور منطقی دونوں اعتبار سے بند گلی بن جاتا ہے۔[2]

معنی کی تعریف:

سچ پوچھئے تو معنی کا سارا کھیل نفسیاتی ہے۔ وینڈریے کہتا ہے "جانوروں کی زبان میں مشار الیہ سے اشارے کی وابستگی مضمر ہوتی ہے اور اس غرض سے کہ یہ وابستگی ختم ہو جائے اور اشارہ شے سے آزاد ہو کر خود اپنی حیثیت قائم کرے ایک نفسیاتی عمل کی ضرورت پڑتی ہے اور یہی انسانی زبان کا نقطۂ آغاز ہے"[1]۔ اوگڈن اور رچرڈس نے معنی کی تجزیاتی تعریف کرتے ہوئے الفاظ اور اشیاء کا تعلق ایک مثلث سے ظاہر کیا اور وہ یہ ہے:

خیال یا اشارہ

علامت ـــــ مشار الیہ
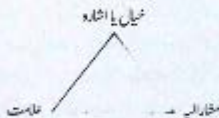
اس مثلث میں علامت لفظ ہے، خیال یا اشارہ تصور ہے اور مشار الیہ کوئی مادی شے یا ذہنی

۱۔ سیمنٹکس، ص ۳۰۷۔ ۲۔ لینگویج، ص ۴۰۔

حقیقت ہے۔ اس نظریے کی رو سے علامت اور مشار الیہ، لفظ اور شے یا زبان اور کائنات میں براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ دونوں کا تعلق ہمارے خیال یا اشارے یعنی تصور کے ذریعے سے قائم ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہمیں دنیا کا علم اپنے آلات حواس کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ کسی شے کی مختلف خصوصیات مثلاً جسامت، رنگ، وزن، سطح، بو، ذائقے کے احساسات انھیں کے توسط سے جب ہمارے ذہن میں پہنچتے ہیں تو ہمیں اس شے کا ادراک ہوتا ہے جس سے اس کا ایک تصور قائم ہو جاتا ہے۔ مادی اشیا کے انھیں تصورات کے ساتھ ساتھ اور انھیں کے سہارے پر غیر مادی یعنی مجرد حقائق کے تصورات بھی بنتے ہیں جن کی بدولت ہم ماضی، حال، مستقبل کے زمانوں میں سفر کرتے، صفات و خواص کی مجرد فضاؤں میں اڑتے، خدا کے سامنے حاضر ہوتے اور عرش و کرسی، لوح و قلم، فرشتگان و قیامت اور جنت و دوزخ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

جب کوئی شخص لفظ "گھوڑا" زبان پر لاتا ہے تو انسان اپنے چاروں طرف زمین پر دیکھنے لگتا ہے اور جب اس سے ابابیل کا لفظ کہا جاتا ہے تو اس کی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ گھوڑے کے لفظ پر آسمان کو تکنے لگے اور ابابیل کو اپنے دائیں بائیں تلاش کرنے لگے۔ وجہ یہ ہے کہ ان جانداروں کی یہ خصوصیات ان کے متعلق قائم ہونے والے ان تصورات کا حصہ ہیں جو اس کے حافظے میں محفوظ رہتے ہیں اور ان کے نام لینے پر فوراً اس کے شعور میں مستحضر ہو جاتے ہیں۔

اس اعتبار سے اوگڈن اور رچرڈس نے معنی کی نفسیاتی تشریح کی کوشش تو کی لیکن ان کے اس تکونے نظریے میں ایک بہت بڑا بنیادی نقص بھی رہ گیا۔ اس تکون کا خیال یا اشارہ جو مشار الیہ یا شے کا تصور ہے اور اس سے تعلق رکھتا ہے، ایک بار قائم ہو جانے کے بعد اس شے کو دوبارہ دیکھ کر ذہن میں ابھر سکتا ہے یا مستحضر ہو سکتا ہے اور صاحب تصور اس شے کو پہچان کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ فلاں شے ہے جو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی لیکن علامت یعنی لفظ سے اس تصور کا کوئی تعلق یا ربط نہیں ہے کیونکہ یہ تصور لفظ کا نہیں ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ لفظ کو سن کر شے کا تصور ابھرے اور وہ تصور شے محسوس کی طرف اشارہ یا رہنمائی کرے۔

اس کے علاوہ اوگڈن اور رچرڈس کا یہ مثلث زیادہ سے زیادہ یادآوری کے عمل کی تشریح ہے۔ ان لوگوں نے یہ نہیں بتایا کہ معنی کسے کہتے ہیں۔

اسٹیفن الیمن اپنی ایک کتاب میں اوگڈن اور رچرڈس کے مذکورہ مثلث کی تشریح کرنے کے بعد کہتا ہے "نام اور مفہوم کا تعلق دو طرفہ ہوتا ہے۔ متکلم کے ذہن میں نام سے پہلے مفہوم ہوتا ہے۔

مثلاً اسے پہلے پنسل کا خیال آئے گا۔ اس کے بعد وہ لفظ "پنسل" زبان سے ادا کرے گا۔ سامع کے لیے یہ ترتیب بالکل الٹ جاتی ہے۔ وہ پہلے نام کی شناخت کرے گا جو اسے پنسل کا خیال دلائے گا۔ یہی وہ دو طرفہ تعلق ہے جسے ہم لفظ کے معنی سے موسوم کر سکتے ہیں[1]۔ یہی بات اس نے اپنی ایک اور کتاب میں بھی دہرائی ہے کہ "معنی نام اور مفہوم کا وہ دو طرفہ تعلق ہے جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کی یاد دلاتے ہیں"[2]۔

معنی کی یہ تعریف بداہتہً غلط ہے۔ ہم لفظ اور مفہوم کے دو طرفہ تعلق کو معنی نہیں کہتے بلکہ یادآوری کہتے ہیں اور معنی اور یادآوری دو الگ الگ باتیں ہیں۔

ایک اور مکتب فکر معنی کے مسئلے پر قطعی مختلف زاویے سے روشنی ڈالتا ہے اور اس کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔ معنی کا یہ نظریہ جسے عمل استعمال کا نظریہ کہا جا سکتا ہے جے آر فرتھ نے پیش کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے "لوگ، متعلقہ فرنیچر، بوتلیں اور گلاس، آوازیں، سامعین کا مخصوص عمل اور الفاظ سب کے سب عمل استعمال کے ترکیبی اجزا ہیں۔ اس طرح معنی کو عمل استعمال کے ترکیبی اجزا کے درمیان مختلف قسم کے تعلقات کا مرکب سمجھنا چاہیے"[3]۔ پھر آگے چل کر وہ اسے دوسرے الفاظ میں دہراتا ہے "دوسرے الفاظ میں معنی عمل استعمال کے ان اشخاص، اشیا اور واقعات کی ملکیت ہوتا ہے جو آپس میں تعلق رکھتے ہیں"[4]۔ وہ اپنی ایک اور کتاب میں لکھتا ہے کہ "عمل استعمال مندرجہ ذیل عناصر ترکیبی میں تعلقات پیدا کرتا ہے"[5]۔

الف: شرکا یعنی اشخاص اور شخصیات کی متعلقہ خصوصیات

۱۔ شرکا کا زبانی عمل

۲۔ شرکا کا غیر زبانی عمل

ب: متعلقہ اشیا

ج: زبانی عمل کا اثر

یہ گویا مندرجہ بالا اشخاص، اشیا اور واقعات ہی کی مدد سے بولے ہوئے الفاظ میں تشریح کی گئی ہے لیکن یہ بات بھی الیمن کی بات سے ہی ملتی ہے جو معنی کو ایک دو طرفہ تعلق کے بجائے بہت سے دو طرفہ تعلقات کا مجموعہ بتاتی ہے لہٰذا اس کی طرح یہ بھی ناقابل تسلیم ہے۔

۱۔ [illegible] ص ۶۴

۲۔ [illegible] ص ۷۰

۳۔ [illegible] ص ۱۸۲

۴۔ دی پرنسپلز آف سیمنٹکس ص ۷۰

۵۔ ایضاً ص ۷

حقیقت یہ ہے کہ نفسیاتی اصول کی رو سے جس طرح کسی شے سے متعلق ہمارے احساسات تصور میں داخل کر حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں اور جب وہ شے ہمارے سامنے دوبارہ آتی ہے تو اس کا تصور حافظے کے خزینے سے نکل کر بام شعور پر آجاتا ہے اور ہمارے سوچنے کے عمل میں مدد دیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ذہن میں اوگڈن اور رچرڈس کی علامت یعنی لفظ کا بھی ایک تصور بن جاتا ہے جسے ان لوگوں نے یکسر فراموش یا نظرانداز کر دیا ہے اور پھر جو قریبی تعلق مشار الیہ یا شے اور علامت یا لفظ میں ہوتا ہے وہی ان دونوں تصورات کے مابین بھی قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اوگڈن اور رچرڈس کے مثلث کی صحیح شکل یوں ہے،

لفظ کا تصور

لفظ   شے کا تصور

جب ہم کوئی لفظ یا نام سنتے یا پڑھتے ہیں تو اس کا تصور شے کے تصور کو ہمارے ذہن میں مستحضر کر دیتا ہے اور ہم کو وہ شے یاد آجاتی ہے۔ یہ یادآوری کا عمل ہے اور اس کا آخری نقطہ شے نہیں ہے جیسا کہ اوگڈن اور رچرڈس نے اپنے مثلث میں دکھایا ہے بلکہ شے کا تصور ہے اور یہ عمل اتنی پھرتی سے مکمل ہو جاتا ہے اور اس کی درمیانی منازل اتنی سرعت سے طے ہو جاتی ہیں کہ انسان کو اس کا شعور بھی نہیں ہو پاتا۔

یہ تو ہوئی یادآوری کے عمل کی بات لیکن جہاں تک معنی کی حقیقت کا تعلق ہے تو معنی سے کوئی شے (مادی یا مجرد) مراد نہیں بلکہ اس شے کا تصور مراد ہوتا ہے یعنی لفظ کے معنی کسی شے کا تصور اور شے کے معنی کسی لفظ کا تصور ہو گا۔ علامت صرف تصور کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہی اس کے معنی ہوتے ہیں۔ نیچے دیے ہوئے جملوں میں لفظ "معنی" کے جو معنی نکلتے ہیں وہ سب کے سب ذہنی اور غیرمادی یا مجرد ہیں اور کسی ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں۔ یہ حقیقت معنی کا تصور کلی ہے اور یہ مختلف رخ اس تصور کلی کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

تسمیہ:

معنی کی حقیقت سمجھنے اور اس کے حدود متعین کرنے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ معنی اور

لفظ میں کیا رشتہ ہے۔ چوتھے باب میں لفظ سے لفظ بنانے کے طریقے بتائے گئے تھے اور یہ تشریح موجودہ باب کے لئے اٹھا رکھی تھی کہ معنی کے لئے پہلے پہل لفظ کس طرح بنا یعنی تسمیہ کیونکر ہوا۔ زبان میں ابتدائی الفاظ کس طرح وضع کئے گئے یعنی وہ لفظ جو کسی دوسرے لفظ سے مشتق نہیں ہیں کیسے وجود میں آئے۔

پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ زبان اتنے قدیم عہد میں ایجاد ہوئی ہے جو اب انسان کے حیطۂ علم سے باہر ہو چکا ہے اور جس کے متعلق معلومات حاصل کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ زبان کے ابتدائی اور بنیادی الفاظ اسی زمانے میں بنے تھے لہذا اب یہ بات کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس وقت کسی معنی کے لئے کوئی لفظ کس مصلحت کے تحت مخصوص کیا گیا۔ البتہ اس وقت غور کرتے یہ صرف اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ لفظ سازی کے لئے آوازوں کے انتخاب میں ضرور ایک ترتیب اور ایک تنظیم پیش نظر تھی جیسے آ۔ جا۔ کھا۔ پی۔ بی۔ سی۔ دو۔ دھو۔ سو۔ لے۔ دے۔ سے۔ کل۔ بال۔ پال۔ مال۔ جال۔ چال۔ باب۔ باپ۔ بات۔ ہات۔ باز۔ باجو۔ باز۔ بار وغیرہ لیکن لفظ کو معنی سے وابستہ کرنے میں کوئی اصول اور مصلحت سامنے نہیں تھی۔ ان کی آوازوں میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس سے انھیں ان معنوں کے لئے مخصوص کرنا پڑتا جن سے وہ وابستہ کئے گئے۔ چنانچہ واضعین زبان نے جس معنی سے جو لفظ چاہا وابستہ اور منسوب کر دیا اور پھر وہ بولنے والوں کی رضامندی سے سکۂ رائج الوقت کی طرح چل نکلا۔

مغربی ماہرین لسانیات بھی متفق اللفظ ہو کر یہی کہتے ہیں کہ لفظ اور معنی کا رشتہ من مانا ہے۔ بلوم فیلڈ کہتا ہے "لسانی روپوں کا اپنے معانی سے تعلق سراسر من مانا ہے"[1]۔ اسٹرٹیونٹ کہتا ہے "آواز اور شے کا تعلق قطعی مصنوعی ہے اور زبان کے لحاظ سے رسم بھی مصنوعی ہوتی ہے۔ حکایت الصوت بھی رسمی ہوتی ہے"[2]۔ وینڈریے کہتا ہے "اشارہ اور مشارالیہ میں لسانی روپ یعنی لفظ اور اس شے میں جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے مطلق کوئی فطری تعلق نہیں ہوتا"[3]۔ وہ آگے چل کر پھر کہتا ہے "آواز اور مفہوم میں کوئی پہلے سے قائم شدہ مطابقت نہیں ہوتی۔ ذخیرۂ الفاظ حکایت الصوت کے مادوں سے تیار نہیں ہوتا"[4]۔

بامعنی الفاظ کی قسمیں:

معنی کے اعتبار سے الفاظ کی مندرجہ ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

الف۔ متحد المعنی: یہ وہ الفاظ ہیں جو مکتوبی اور ملفوظی روپ میں ایک دوسرے سے مختلف

۱۔ لینگویج ص ۲۷۵
۲۔ لینگویج ص ۱۰۵
۳۔ اسپکٹس آف لینگویج ص ۳۰
۴۔ ایضاً ص ۳۰

ہوتے ہیں لیکن ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ انھیں ہم معنی یا مترادف بھی کہتے ہیں مثلاً ران اور ٹانگ دونوں مترادف الفاظ ہیں اور اس عضو بدن کے لئے بولے جاتے ہیں جو کمر سے نیچے تک پھیلا ہوا ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں مترادفات نہیں ملتے۔ بلوم فیلڈ اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ "حقیقی مترادفات کا وجود نہیں ہے"[1]۔ پامر کہتا ہے کہ "کسی ایک زبان میں ایسے دو الفاظ کا وجود ممکن نہیں جن کے معنی بالکل ایک ہی ہوں"[2]۔ ان لوگوں کا یہ خیال شاید اس وجہ سے قائم ہو گیا ہے کہ جب کسی معنی کے لئے کسی زبان میں پہلے ہی سے ایک لفظ موجود ہو تو پھر اہل زبان انھیں معنوں میں دوسرا لفظ گھڑنا عبث سمجھتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے الفاظ پر اگر غور کیا جائے جنھیں ہم مترادف سمجھتے ہیں تو ان میں اختلافات مل جائیں گے۔

۱۔ بعض مترادفات دو بولیوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے اجالا اور چاندنا۔ اجالا اردو کا لفظ ہے اور چاندنا اس مقامی بولی میں رائج ہے جو میرٹھ مظفر نگر کی طرف بولی جاتی ہے چنانچہ اسی کے زیر اثر یہ لفظ اس علاقے کے اردو بولنے اور لکھنے والے بھی استعمال کر بیٹھتے ہیں۔

۲۔ بعض الفاظ دو مختلف سنگتوں سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً بلوانا اور منگوانا۔ بھینچنا اور دبانا۔ آدمی بلوائے جاتے ہیں اور آم منگوائے جاتے ہیں۔ آدمی منگوائے نہیں جاتے اور آم بلوائے نہیں جاتے۔ ہم دانت بھینچتے ہیں دباتے نہیں اور پاؤں بھینچتے نہیں دباتے ہیں۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ان کے ماحول میں فرق ہوا تو کیا معنی کے لحاظ سے تو یہ قطعی مترادف ہیں لیکن بعض عالموں کے خیال کے مطابق مترادف وہ ہوتے ہیں جو بالکل ایک ہی سنگت یا ایک ہی ماحول میں استعمال ہوتے ہیں۔

۳۔ بہت سے الفاظ اپنے معنوں میں باہم قریب ہوتے ہیں چنانچہ ان پر ہم معنی ہونے کا گمان ہو جاتا ہے۔ لغت نگار اسی قسم کے مترادف سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً بل کے مترادفات زور۔ کروٹ۔ بھروسا۔ گھمنڈ۔ فوج۔ ٹیڑھ۔ اتر۔ گتھی۔ کیٹ۔ بھینٹ وغیرہ ہیں۔ اب اگر ہم ان میں سے ہر ایک کے مترادفات تلاش کرنے نکلیں تو ہمیں ایک ایک کے بہت سے مترادفات ملتے چلے جائیں گے اور ہم ابتدائی لفظ کے معنی سے دور سے دور تر ہوتے چلے جائیں گے۔

مترادف کے جانچنے کا ایک طریقہ بدل ہے۔ مترادفات تمام فقروں اور ماحولوں میں ایک دوسرے کا بدل ہونا چاہئیں لیکن اس قسم کے مترادفات نہیں ملتے البتہ کچھ الفاظ بعض حالات میں ایک

۱۔ لینگویج ص ۱۴۵۔ ۲۔ سیمنٹکس ص ۵۹

دوسرے کا بدل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً نظر ترچھی بھی ہوتی ہے اور ٹیڑھی بھی لیکن سڑک صرف ٹیڑھی ہوتی ہے۔ سر چھپاتے بھی ہیں اور ڈھانکتے بھی ہیں لیکن غم صرف چھپاتے ہیں۔

اس جانچ کا دوسرا طریقہ تضاد ہے۔ مثلاً گہرے کے متضاد اتھلا اور سرسری دونوں ہیں لیکن اتھلا گہرے کا زیادہ صحیح متضاد ہے۔ بھلا یہ خیال کہ اگر دو لفظوں کا متضاد ایک ہی لفظ ہو تو وہ آپس میں مترادف ہوں گے کلی طور پر درست نہیں ہے بلکہ ہم اس طریقے سے بھی اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صرف بعض حالات میں ہی دو الفاظ ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں۔

مترادف کے خلاف ان تمام بیانات اور تمام خیالات کے باوجود میرا یہ مشاہدہ ہے کہ ایک زبان میں بھی بعض بعض مترادف الفاظ مل جاتے ہیں اور وہ ہمروپ ہوتے ہیں جن کا تفصیلی ذکر "صوتیات" کے باب میں پہلے گزر چکا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ بعض ہمروپ بھی مندرجہ بالا الفاظ کی طرح ہر حال میں مکمل طور پر مترادف نہیں ہوتے بلکہ صرف بعض حالات میں ہی مترادف ہوتے ہیں جیسے چھوٹنا اور چھٹنا۔ بل اور بانک تاہم کچھ ایسے ہمروپ بھی ہیں جو ہر حال میں متبادل ہوتے ہیں جیسے ڈھانک اور ڈھاپ۔ ڈھانکنا اور ڈھانپنا۔ ڈھکنی اور ڈھپنی۔ گانس اور گانٹھ۔ گانسنا اور گانٹھنا۔ تاگا اور دھاگا۔ جھلکا اور چھلکا۔ ڈھب اور ڈھنگ وغیرہ۔

ب۔ قریب المعنی۔ وہ دو الفاظ جن کے معنی ایک نہیں ہوتے بلکہ ملتے جلتے ہوتے ہیں جیسے کھوٹ اور کسر۔ دکھ اور بھول۔ جان اور پہچان۔ جھپٹ اور لپک۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن کو لغات میں بالعموم بطور مترادف لکھا جاتا ہے۔

ج۔ متضاد۔ وہ الفاظ جن کے معنی ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں جیسے اجلا اور میلا۔ رات اور دن۔ اونچ اور نیچ۔ بھاری اور ہلکا۔ اچھائی اور برائی۔ چھوٹا اور بڑا وغیرہ۔

د۔ کثیر المعنی۔ وہ الفاظ جو ایک سے زیادہ معنی رکھتے ہیں۔ الفاظ کی یہ قسم دنیا کی تمام زبانوں میں سب سے زیادہ عام ہے۔ کثرت معنی زبان کی وہ فطری خصوصیت ہے جس کا ذکر پچھلے باب میں بھی کیا جا چکا ہے۔ پامر کہتا ہے "کثرت معنی زبان کا ایک عام رجحان ہے"[1]۔ پھر آگے چل کر کہتا ہے "جہاں مختلف لفظوں کے ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں وہاں ایک ایک لفظ کے بھی کئی کئی معنی ہوتے ہیں"[2]۔ الیمن بھی یہی کہتا ہے کہ کئی کئی لفظ ایک ہی معنی ظاہر کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی بھی ہو سکتے ہیں[3]۔

---

۱ و ۲۔ سیمنٹکس ص ۶۵۔ ۳۔ دی پرنسپلز آف سیمنٹکس ص [illegible]

(۷)۔ کے مطابق: وہ اپنے باپ پر پڑا ہے۔ تم وقت پر آئے ہو۔ تیرے میرے کہے پر مت چلو۔

(۸)۔ کے لئے، کی خاطر: وہ جانے پر تلا بیٹھا ہے۔ مزدور آج سے کام پر آنے لگے۔ ہر شخص دم پر مرتا ہے۔ جس پہ مرتا ہے زمانہ وہ ادا کون سی ہے۔ اپنی غرض پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔

(۹)۔ کی جانب، کی طرف: سوداگر رفتہ رفتہ بے ایمانی پر آ گیا۔ ہر چیز اپنی اصل پر جاتی ہے۔ تمھاری نظر کس پر پڑی ہے جو بے چین ہو۔ منگنی کے بعد ہی لوگ ایک دم کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

(۱۰)۔ کے حساب سے: قادر چار سو روپے ماہانہ پر ملازم ہے۔ نو کو تین پر تقسیم کرو تو تین حاصل ہوں گے۔ ٹھیکے پر مکان بنوانے سے خرچ زیادہ آتا ہے۔ خالد مزدوری پر کام کرتا ہے۔

(۱۱)۔ کے تئیں: ہمارا ایمان خدا پر ہے۔ ہمیشہ قوت بازو پر بھروسہ کرو۔ مہنگائی سے غریبوں کی تو جان پر بن گئی ہے۔

(۱۲)۔ کے باعث: تم کس بات پر تنا ہو۔ وہ اپنے کئے پر نادم ہے۔ اس بات پر ان کی خوب تعریف ہوئی۔ ذرا سی غلطی پر لینے کے دینے پڑ گئے۔ دولت پر غرور مت کرو۔

(۱۳)۔ کے ذمے: ہم پہ یہ کام نہیں ہوتا۔ تم پہ جو ہو سکے تو کر لو۔

(۱۴)۔ کے پاس: اس پہ کیا رکھا ہے جو تم کو دے۔ میں نے حامد پر پچاس روپے رکھوا دیئے ہیں۔

(۱۵)۔ کے وقت: عید پر سب اکٹھے ہوں گے۔ دفتر والے گیارہ بجے پر جانے لگتے ہیں۔

کو

(۱)۔ کی طرف، کی جانب: یہ سڑک باغ کو جاتی ہے۔ غریب کی حالت دیکھ کر کلیجا منہ کو آتا ہے۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

(۲)۔ کے وقت: رات کو جلدی سو جانا چاہئے۔ کل کلاں کو مجھے اُلاہنا دینا۔

دن کو ہم ان سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے
رسم پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے — حسرت موہانی

(۳)۔ کے لئے، کی خاطر، کی غرض سے: پینے کو پانی لاؤ۔ کسی کے گھر جاؤ تو گھڑی بھر کو تو جاؤ۔ شکاری علی الصباح ہی شکار کو چلے جاتے ہیں۔

کہنے کو کہہ دیا انھیں حاتم پہ کیا کہوں — اک سیل بہہ گئی عرق انفعال کی

(۴)۔ کے تئیں: تم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہر ایک سے الجھنے لگے ہو۔ احمد کو بخار آ گیا۔ بلی کو مت مارو۔ انصاف سے کہو آخر خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ آدمی کو موت ہے بات کو موت نہیں ہے۔ مجھ کو پنکھا جھلو۔

(۵)۔ کے قریب: ریل آنے کو ہے۔ میں اس سے کہنے کو ہوں کہ کچھ دن کے لئے زبان بند رکھے۔

(۶)۔ کے بارے میں، کی بابت: مصیبت میں کون کس کو پوچھتا ہے۔ بازار کے بھاؤ کو کیا کہتے ہو بس آگ لگی ہوئی ہے۔

(۷)۔ کے عوض، کے بدلے میں: آج کل اچھی کا کمبل کتنے کو آتا ہے۔ ہوٹل سے ایک نان ساٹھ پیسے کو آتی ہے۔

تک یا تلک

(۱)۔ کی حد میں، کے تئیں یا تئیں۔ (راجستھانی تائیں، پنجابی توڑ): یہ بات تمھیں تک رہے۔ وہ شام تک چلا جائے گا۔ ہم کراچی تک آ گئے۔ ہمیں گھر تک پہنچا دو۔ میں ذرا بازار تک جا رہا ہوں۔ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام۔

(۲)۔ بھی: مجھے اس کا نام تک یاد نہیں۔ مغرور دولت مند غریبوں کی طرف دیکھتا تک نہیں۔ آج کل، تحت تو کیا تحت افسر تک رشوت لیتے ہیں۔

(۳)۔ سے پہلے پہلے: تم کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک۔ دنیا کے جھمیلوں سے قبر تک پیچھا نہیں چھوٹتا۔

میں

(۱)۔ کی وجہ سے: بعض لوگ اولاد کی محبت میں بہت خوار ہوتے ہیں۔ اے داغ تم تو بیٹھ گئے ایک آن میں۔

(۲)۔ کے متعلق: نفع نقصان کی بات الگ ہے پر آپ کی کارکردگی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

(۳)۔ کے اندر: کپڑے الماری میں رکھے ہیں۔ آتے میں بازار سے مٹھائی لیتے آنا۔ یہ کام کتنے دن میں ہو جائے گا۔

(۴)۔ کے عوض: ایک قلم کتنے میں آتا ہے؟ ایک ایک لفظ کئی کئی معنوں میں بولا جاتا ہے۔

(۵)۔ کے ذریعے: راہ پر ان کو لگانے تو ہیں باتوں میں۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے۔

(۶)۔ زیر اثر: آج احمد غصے میں ہے۔ میرا بیٹا میرے کہے میں ہے۔

(۷)۔ لحاظ یا اعتبار سے: یہ تختہ لمبائی میں مجھے فٹ ہے۔ آٹا تول میں چار سیر ہے۔ وہ مجھ سے قد میں بڑھا ہوا ہے۔ احمد محمود سے باتوں میں پیچھے رہ گیا۔ بعض لوگ دیکھنے میں کم عمر لگتے ہیں۔ یہ پھل کھانے میں میٹھا ہے۔ ہم سمجھنے میں نہیں چوکتے۔

(۸)۔ کے لئے کو: تمہارے جانے میں کتنے دن باقی ہیں؟ انھیں یہاں آنے میں کیا عذر ہے۔

کا (واحد مذکر) ، کی (واحد و جمع مونث) ، کے (جمع مذکر)

(۱)۔ ملکیت: وکیل کا گھر۔ سردار کے گھوڑے۔

(۲)۔ مواد: سونے کا پانی۔ چاندی کا روپیا۔ کاغذ کا کھلونا۔ پتھر کا ڈھیر۔ کانچ کے برتن۔ جست کی صراحی۔

(۳)۔ نسبت: کام کا۔ بیچ کا۔ نام کا۔ نانی کا۔ جنم کا اندھا۔ گھر کا بھیدی۔ گھر کی مرغی۔ بڑھاپے کی بدو۔ یعقوب کے بیٹے۔ سرگودھے کے کنو۔ شاہجہاں آباد کے آم۔

(۴)۔ کے لحاظ یا اعتبار سے: آنکھ کا اندھا۔ گانٹھ کا پورا۔ دل کی نرم۔ دل کا برا۔ ہاتھ کا سچا۔ پیٹ کا ہلکا۔ گھمنڈ کا ایکا۔ تھان کا ٹرا۔ تلوار کا دھنی۔ قوم کا جلاہا۔

(۵)۔ کے لئے کی غرض سے کی خاطر: جانے کا ہماد۔ بیٹھنے کا ٹھکانا۔ پینے کا پانی۔

کے

(۱)۔ کے یہاں: آج احمد کے دعوت ہے۔ حامد کی چار بہنیں ہیں۔

(۲)۔ کے میں: بلی کے چوٹ لگ گئی۔

کر یا کے ، کر کے ، کر کر

(۱)۔ کے بعد: کھانا کھا کے چلیں گے۔ وہ مڑ کر چلے بھی گئے۔

(۲)۔ کے لحاظ یا اعتبار سے: میں خاص کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے خاص کر کے آپ

کے پاس بھیجا گیا ہے۔

(۳)۔ طریقہ: دوڑ کر مت چلو۔ ہنس کر بات کرو۔ بڑھ کر لو کیونکہ۔ ایک ایک کر کے اندر آؤ۔

(۴)۔ بحیثیت، بطور: وہ احمد کر مشہور ہے۔

۵۔ مختلف المعنی: یہ وہ الفاظ ہیں جو قطعی مختلف اور ایک دوسرے سے بے تعلق اور غیر مربوط معنی دیتے ہیں۔ دراصل ان میں سے ہر لفظ دو ہم شکل اور ہم آواز الفاظ کی ایک مرکب تصویر ہوتا ہے اور وہ دونوں کے دونوں الفاظ اپنی اپنی بناوٹ کے لحاظ سے مرکب اور الگ الگ مادوں سے بنے ہوتے ہیں۔ ان کی پہچان آسانی سے نہیں ہو پاتی کیونکہ دور سے یہ دوسرے کثیر المعنی الفاظ کے مشابہ نظر آتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ بالا ایک کثیر المعنی لفظ دل کے مختلف معنی یہ ہیں:

۱۔ طاقت، سہارا، گھمنڈ، فوج۔ ۲۔ ٹیڑھ، فرق، شکن، کینہ، کپٹ۔ ۳۔ بحیثیت، صدقہ

اور ایک مختلف المعنی لفظ اٹل کے مختلف معنی یہ ہیں:

۱۔ نہ ٹلنے والا، پکا، مستحکم، قائم۔ ۲۔ بھرا ہوا، بھٹکا ہوا، سیر، پر

لفظ بل کے معنی میں نے تین الگ الگ گروہوں میں بانٹ دیے ہیں کیونکہ ان میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن یہ لفظ اردو کا ہے اور چھوٹے سے چھوٹا مادہ ہے جس کے مرکب ہونے کا یہاں بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کے باوجود پھر ان کے مفرد ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ معنی کے ان گروہوں کے لحاظ سے اس لفظ کے تین بہروپ بنتے ہیں۔

۱۔ بل ۲۔ بانک، بانٹ، بٹ اور ۳۔ بود [باعد] ، بحیثیت

ٹھیک اسی طرح میں نے اٹل کے معنی بھی دو گروہوں میں رکھے ہیں جن میں دور دور تک کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ پھر بھی ممکن ہے کہ ان کے مابین کسی کو کوئی خفیف سا ربط نظر آجائے اس لئے میں ان مرکب الفاظ کا تجزیہ پیش کرتا ہوں جس سے ثابت ہو جائے گا کہ یہ ایک نہیں دو ہم صورت اور ہم آواز الفاظ ہیں جو بظاہر ایک لفظ نظر آتے ہیں۔

۱۔ اٹل = ا (نہیں) + ٹل (ٹلنا کا مادہ جگہ سے ہٹنا) ، نہ ٹلنے والا۔ اس کا بہروپ ہے اٹل (نہ چلنے والا)۔

۲۔ اٹل = اٹ (اٹنا کا مادہ، بھر جانا) + ال (لاحقہ فاعلی) ، بھرا ہوا۔ اس کا بہروپ ہے اٹل (اٹنے والا)۔

اس قسم کے چند اور الفاظ مع تجزیہ نیچے دیے جاتے ہیں:

بانکا: ۱۔ پیٹ بمعنی کمر + کا (لاحقہ) ، کمر میں لپیٹنے کا دوپٹہ۔ ۲۔ بانکنا کا حاصل، تمام زمین پر دے مارا ،

نیچے گرا دیں۔ ۲۔ ہنکنا بمعنی ، ہنکایا ہوا + کا حالیہ تمام ، ہنکایا ہوا ، ورم کم ہوا۔

کھنکنا ۱۔ کھنکنا کا حالیہ تمام ، ٹکرایا ، شور ، ٹکرانے کی آواز ۔ ۲۔ کھٹ بمعنی کھولنا + کا (لاحقہ) ، پنچ ، کھولنے کا پرزہ۔

پڑتی ۱۔ پڑت بمعنی حساب ، اندازہ + ای (علامت تانیث) ، حصہ ، چندہ۔ ۲۔ پڑنا کا حالیہ تام مونث ، گری۔

غرض یہ ہے کہ اگر مختلف معنوں میں باہمی ربط موجود ہو یا لفظ اپنے معنوں سے بھرپور طریقے سے ملا ہوا ہو تو اس لفظ کو کثیر المعنی سمجھنا چاہئے اور اگر معنوں میں دور کا بھی ربط نہ ہو اور الفاظ کے اساسی مادے دو دو ہوں تو انھیں مختلف المعنی (ہم آواز) سمجھ کر لغت نگار کو ایک کی جگہ اس کے دو اندراجات کرنا چاہئیں۔

معنی کی اقسام :

جس طرح کسی نئے معنی کے لئے نیا لفظ تراشا جاتا ہے اسی طرح ابتدا میں بھی ایک معنی کے لئے ایک لفظ بنایا گیا تھا۔ کچھ وقت تک اس لفظ کے ایک ہی معنی رہے پھر اس کے معنوں میں اضافہ ہونے لگا۔ آگے چل کر اس ایک لفظ کے بہت سے معنی ہو گئے اور ہم اس لفظ کو کثیر المعنی کہنے لگے۔ دنیا کی ہر زبان میں بیشتر الفاظ کثیر المعنی ہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ معنی کتنی قسم کے ہوتے ہیں؟

ایلوٹسکل کہتا ہے " ہر لفظ معنوں کی ایک قوس قزح پیش کرتا ہے لیکن یہ سمجھا گیا ہے کہ ان سب کو ایک غالب معنی کے تحت رکھا جا سکتا ہے[1]۔"

وینڈرے کہتا ہے " یہ تسلیم کرنا کہ ان لفظوں کے ایک بنیادی معنی اور اس سے نکلے ہوئے ثانوی معنی بھی ہوتے ہیں اس مسئلے کو تاریخی نقطۂ نظر سے پیش کرنا ہے[2]۔"

بلوم فیلڈ کہتا ہے " مختلف معنوں کے بارے میں خاص بات یہ ہے کہ ہم ان میں سے ایک کو معیاری (یا مرکزی) اور دوسروں کو ذیلی (استعاری ، مجازی) سمجھتے ہیں[3]۔"

مندرجہ بالا تینوں بیانات میں ایک ہی بات کہی گئی ہے اور معنی کی دو ہی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ایلوٹسکل کا غالب ، وینڈرے کا بنیادی اور بلوم فیلڈ کا مرکزی معنی ایک ہی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسری قسم میں جسے ایلوٹسکل کے لحاظ سے مغلوب ، وینڈرے کے الفاظ میں ثانوی اور بلوم فیلڈ

۱۔ ہائیکس آف لینگویج ص ۲۲۰۔ ۲۔ لینگویج ص ۱۹۰۔ ۳۔ لینگویج ص ۴۴۹۔

کے خیال سے ذیلی کہتے ہیں لفظ کے باقی ماندہ تمام معانی آجاتے ہیں۔ مشرق والے بھی معنی کی یہی دو بڑی قسمیں بتاتے ہیں جنھیں ہمارے یہاں حقیقی یا لغوی اور مجازی یا مرادی معنی کہتے ہیں۔ ابتدا میں لفظ جس معنی کے لئے بنا تھا وہی اس کے حقیقی معنی ہیں۔ اس لفظ کے دوسرے معنی اسی حقیقی معنی سے نکلتے ہیں اس لئے یہ سب کے سب باہم مربوط ایک لڑی میں گندھے اور ایک رشتے میں پروئے ہوتے ہیں۔

ایک لفظ کے تمام مجازی معنی ایک ہی کنبے کے افراد ہیں جن کا سربراہ حقیقی معنی ہے لیکن معنوں کی کثیر تعداد میں حقیقی اور مجازی کے درمیان امتیاز کرنا ہمیشہ تو نہیں البتہ بعض اوقات ضرور دشوار ہو جاتا ہے مثلاً لفظ " گھوڑا " کے کم سے کم دو معنی ہیں۔ اول سواری کا ایک جانور اور دوسرے بندوق کا ایک پرزہ۔ ان پر غور کرنے سے ہمیں نہایت آسانی سے یہ اندازہ ہو گیا کہ سواری کا جانور اس کے حقیقی معنی ہیں جن کے لئے یہ لفظ پہلے پہل بنا تھا اور بندوق کا پرزہ مجازی معنی ہیں کیونکہ گھوڑا (جانور) بندوق سے قدیم تر ہے۔ چونکہ دونوں میں کھوڑنے کی ایک صفت مشترک تھی اس لئے بندوق کے پرزے کو بھی یہ نام دے دیا گیا لیکن اس مصرعے میں کہ،

بازار سے کل تُو خرید کر مجھے کل تُو سے ترک کی کسی کل بھی کل نہیں پڑتی

لفظ " کل " کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تفریق مشکل ہے۔ یہ معنی بالترتیب یہ ہیں۔ ۱۔ مشین ، ۲۔ گزرا ہوا دن ، ۳۔ پہلو یا کروٹ ، ۴۔ چین

اگر یہ سوچا جائے کہ انسان نے دنوں کے نام پہلے رکھے ہوں گے اور مشین بعد میں ایجاد کی ہوگی تو گزرے ہوئے دن ، پہلو اور چین میں سے کوئی ایک حقیقی معنی ہو گا لیکن لفظ " کلائی " تو انسانی جسم ہی کا حصہ ہے جو پہلے کل سے بنا ہے اس لئے اس کا استحقاق اتنی آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر کروٹ کے ساتھ ساتھ چین بھی انسان کی ہی محسوس کرنے والی کیفیت ہے۔ کروٹ انسان کے جسم کے ساتھ ساتھ ہے جو اسے رخ اور سمت کا احساس دلاتی ہے اور چین کی اگر کیفیت نہیں تو ضرورت تو انسان نے ضرور پہلے ہی دن سے محسوس کی ہو گی۔ اب اگر ایسی صورت میں مشین کو پیچھے بھی ڈال دیا جائے تو باقی ماندہ تین معنوں میں سے اس منصب کا استحقاق کسے دیا جائے۔ ہم اس لفظ " کل " کو مختلف المعنی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ کثیر المعنی لفظ ہے اور ارتباط معنوی کے اصول پر پورا اترتا ہے۔ اس کے مندرجہ بالا چاروں معنی بخوبی مربوط ہیں جن کا ربط باہم حرکت سے قائم ہے یعنی مشین چلتی ہے ، دن گزرتا ہے ، کروٹ بدل جاتی ہے اور چین بھی آتا جاتا رہتا ہے۔

میں ایک بار پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ لفظ اور معنی میں اہمیت معنی کی ہے۔ اگر معنی

نہ ہوتے تو لفظ کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ متکلم لفظ صرف اس لئے استعمال کرتا ہے کہ سامع تک معنی کا ابلاغ ہو جائے۔ اگر ابلاغِ معنی مد نظر نہ ہو تو گفتگو پاگل کی بڑ ہے۔ پھر لفظ کے دسیوں معنی میں سے بھی حسبِ حقیقی یا لغوی معنی کی ہوتی ہے جس سے دوسرے تمام معانی نکلتے ہیں جنھیں مجازی کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ مجاز کی عمارت حقیقت کی اساس پر قائم ہوتی ہے۔ حقیقت ایک ہے، اٹل ہے اور ناقابلِ تغیر ہے اور مجاز کے شئون وصور مختلف اور قابلِ تغیر ہیں۔ لفظ کے حقیقی معنی کبھی نہیں بدلتے اور بدل بھی نہیں سکتے۔ نوعِ انسانی خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی محنت پر پانی نہیں پھیر سکتی۔ اگر حقیقی معنی بدل جائیں تو دنیا عبد بابل بن کر رہ جائے۔ انسان ایک دوسرے کی بات سمجھنے سے قاصر رہ جائیں اور نتیجے میں اپنا اپنا مقصود کھو بیٹھیں۔

مجاز کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں اور پیدا ہوتی رہتی ہیں چنانچہ متکلم اور سامع کا ذہنی پس منظر بدل جانے کے ساتھ ساتھ نئے نئے مجازی معنی پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ پیدائش بھی اسی حد تک ممکن ہے جہاں تک متکلم اور سامع کے ذہنی پس منظر میں مطابقت یا مشارکت قائم رہتی ہے۔ اس سے آگے متکلم کے مجازی معنی بھی سامع کی فہم سے باہر ہو جاتے ہیں۔

جس طرح ہم زبان کے بنیادی اور ابتدائی الفاظ سے نئے نئے الفاظ ڈھالتے رہتے ہیں جنھیں مشتق کہتے ہیں اسی طرح ابتدائی اور بنیادی معنی سے بھی جنھیں حقیقی معنی کہتے ہیں ہم نئے نئے معنی پیدا کرتے رہتے ہیں جنھیں مجازی معنی کہتے ہیں۔ مغرب کے بعض لوگ اس عمل کو انتقالِ معنی کہتے ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے۔ جس طرح ہم مادے سے لفظ بنانے کو لفظ کی تبدیلی نہیں لفظ سازی کہتے ہیں اسی طرح حقیقی معنی سے مجازی معنی نکالنے کو بھی انتقالِ معنی کی جگہ معنی سازی یا معنی آفرینی کہنا چاہئے کیونکہ ابتدائی یا حقیقی معنی اپنی جگہ بدستور قائم رہتے ہیں البتہ ہم ان کی مدد سے دوسرے لغی نئے معنی پیدا کر لیتے ہیں اور جس طرح نئے لفظ ابتدائی لفظوں یعنی مادوں سے بالکل مختلف اور بے ربط نہیں ہو پاتے اسی طرح مجازی معنی بھی حقیقی معنوں سے مربوط رہتے ہیں۔

معنی آفرینی:

امریکی ماہر لسانیات بلوم فیلڈ نے اپنی کتاب میں مجازی معنوں کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی ہیں[1]:

۱۔ جیوفرے لیچ۔ سیمانٹکس ص ۲۱۱ اور مادہ نیز لنگویج ص ۲۲۱۔
۲۔ لنگویج ص ۲۲۶۔

تحدید	کھانے کے لئے گوشت	
توسیع	چھینگے کے لئے چڑیا	
استعارہ	کاٹنے والے کے لئے تیغ	
مجاز مرسل (مکانی اور زمانی قربت)		
	گال کے لئے	جبڑا
(جزو اور کل)		
	اصاطے کے لئے	شہر
	گرم کرنے کے لئے	چولھا
مبالغہ (قوی سے کمزور معنی)		
	بجلی گرانا کے لئے	حیرت زدہ کرنا
طنز (کمزور سے قوی معنی)		
	ستانے کے لئے	مار ڈالنا
تحقیر	لڑکے کے لئے	غلام
تفضیل	لڑکے کے لئے	شہزادہ

مغرب کے دوسرے ماہرین لسانیات نے بھی انتقالِ معنی کی قریب قریب انھیں اقسام کا ذکر کیا ہے[1]۔

مشرق والوں نے بھی علم بیان یعنی مجاز کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ اور تلمیح اور پھر ان کی بھی اور بہت سی ذیلی قسمیں کر دی ہیں[2]۔

الف۔ اقسامِ استعارہ:

۱۔ اصلیہ ۲۔ تبعیہ ۳۔ مطلقہ ۴۔ مجردہ ۵۔ مرشحہ ۶۔ تمثیلیہ ۷۔ بالکنایہ
۸۔ تخییلیہ ۹۔ وفاقیہ ۱۰۔ عنادیہ۔

ب۔ مجاز مرسل:

۱۔ کل سے جزو مراد لینا ۲۔ جزو سے کل ۳۔ سبب سے مسبب ۴۔ مسبب سے سبب
۵۔ ظرف سے مظروف ۶۔ مظروف سے ظرف ۷۔ زمانہ سابق کی حالت سے تعبیر کرنا۔

۱۔ ویمسٹ۔ لنگویج ص ۲۰۰۔
۲۔ جیوفرے لیچ نے بھی اپنی کتاب (سیمانٹکس ص ۲۱۴، ۲۱۶) میں اسی طرح چند قسمیں گنوائی ہیں۔

۱۷۔ خوشی — (۲۲)۔ پھڑک لے

۱۸۔ قوت، سرمایہ — (۳/۲۸)۔ تو کو، بُوتر (۲۵) پونجی۔

۱۹۔ ابھار — (۲۳)۔ پھلک گے۔

۲۰۔ ہوش — (۲۳)۔ بھبک گے۔

۲۱۔ چنگاری — (۲)۔ پات گے، پاٹ گے۔

معنی کے جتھے:

جس طرح معنی آفرینی کا تعلق صوتی تبادل کے اصولوں سے ہے اسی طرح معنی کے جتھوں کا تعلق بھی بنیادی آوازوں کے جتھوں سے ہے اور آوازیں دو واضح جتھوں میں منقسم ہیں جیسا کہ تیسرے باب (صوتیات) میں بتایا جا چکا ہے۔ چنانچہ اردو زبان کے معنی کے بھی دو بڑے بڑے اور واضح جتھے ملتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اردو زبان کے واضعین نے پوری کائنات کو دو حصوں میں یا استعارے میں یوں کہئے کہ انسانی تصورات کو دو کیمپوں میں تقسیم کر دیا ہے جو دو متوازی خطوط کی طرح کسی نقطے پر ایک نہیں ہوتے اور کبھی ایک دوسرے کی حدود میں داخل نہیں ہوتے لیکن ان میں کوئی باہمی کاوش بھی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ایک جگہ جمع بھی ہو جاتے ہیں البتہ اپنی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں اور ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوتے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھانے کے لئے ذیل میں چھوٹے سے چھوٹے ابتدائی مادوں کے دونوں متوازی سلسلے درج کئے جاتے ہیں جو ایک سرا اور ایک آخری طویل سرے سے بنے ہیں اور جو معنوں کے دو متوازی جتھوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

پہلا جتھا:

با پھا بھو پو۔ تھا دا تو دھو۔ جا چھا جھو چو۔ کھا گا کو گھو۔ ٹھا ڈا ٹو ڈھو۔ را سا لا۔
ما مے نا نے۔ او ہو وو یو۔

دوسرا جتھا:

بھا پا بو پھو۔ تا دھا تھو دو۔ جھا چا جو چھو۔ کا گھا کھو گو۔ ٹا ڈھا ٹھو ڈو۔
رو سو لو۔ مھا مے نھا نے۔ آ یا وا یا۔

۱، ۲، ۳، ۴، ۵۔ کاف کے اندراج سے۔ ۶۔ چنگا۔ ۷۔ بیج بھاگا پیت بچا (بگڑا)۔

رہ، ڑ، ڑھ، ل، و اور حلقی نون (ں) سے کوئی مادہ یا لفظ شروع نہیں ہوتا اس لئے ان کو الگ رکھا گیا ہے لیکن اس سے دلیل میں کوئی کمزوری نہیں آتی۔

مندرجہ بالا نقشے میں پہلے جتھے کے تمام مادوں سے بننے والے الفاظ کے معنی باہم مربوط ہیں اور دوسرے جتھے کے معنی بھی آپس میں ربط رکھتے ہیں لیکن ایک جتھے کے معنی دوسرے جتھے کے معنوں سے جدا، مختلف اور عدم مطابق ہیں۔ ان کا فرق سمجھنے کے لئے ان پر ایک اور آواز مثلاً ل کا اضافہ کر لیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ معنی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ نیچے ان ابتدائی مادوں کا نقشہ دیا جاتا ہے جو اسم بھی ل پر ختم ہوتے ہیں۔

پہلا جتھا:

بال پھال بھول پول۔ تھال دال تول دھول۔ جال چھال جھول چول۔ کھال گال کول گھول۔
ٹھال ڈال ٹول ڈھول۔ رال سال لال۔ مل مھیل نال نھیل۔ اول ہول ول یل۔

دوسرا جتھا:

بھال پال بول پھول۔ تال دھال تھول دول۔ جھال چال جول چھول۔ کال گھال کھول گول۔
ٹال ڈھال ٹھول ڈول۔ رول سول سل۔ مھال میل نھال نیل۔ آل یال وال یال۔

مندرجہ بالا نقشے میں پہلے جتھے کی بال یا بال پہلے ہی جتھے کے پھل یا پھلی سے ملتی ہے لیکن دوسرے جتھے کے پال اور پھول، پات اور بھانا (دیکھنا بھالنا) سے بالکل الگ ہے علی ہذا القیاس۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی آوازیں ہی بنیادی طور پر ایک دوسرے کے لئے غیر جنس ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مندرجہ بالا جتھوں میں سے ایک جتھے کے معانی دوسرے جتھے کے معانی سے مختلف ہیں اور اگرچہ متضاد معنی بھی دونوں جتھوں میں منقسم ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک جتھے کے تمام معانی دوسرے جتھے کے معانی کے متضاد بھی ہوں۔ یہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

لغت نگاری:

زبان کے الفاظ جس کتاب میں اکٹھے کئے جاتے ہیں اسے اردو میں لغت کہتے ہیں۔ دنیا کی کسی زبان کا آج تک کوئی مکمل لغت تیار نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ پورے لسانی سرمائے کا

جمع کرنا کسی ایک یا دو یا چار انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ زبانوں میں مسلسل نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ خصوصاً علوم کی ترقی کے باعث آئے دن نئی نئی اصطلاحات وضع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود محدود اور وسیع دونوں پیمانوں پر بعض خصوصی (یعنی اصطلاحی وغیرہ) اور بعض عمومی لغات مدون ہوتے ہیں اس لئے اردو میں لغت نگاروں کے لئے چند اصول مختصر طور پر نیچے درج کئے جاتے ہیں۔

لغت کی تقسیم: انگریزی میں ہر حرف سے ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور ہر حرف کے باب میں اسی حرف سے شروع ہونے والے الفاظ درج ہوتے ہیں۔ الفاظ کی ترتیب میں بھی حروف تہجی کی ترتیب ملحوظ رکھی جاتی ہے کیونکہ انگریزی کی رومن لپی میں سر اور اسر دونوں ہی کے لئے حروف مقرر ہیں۔ عربی لغت میں بھی ابواب حروف تہجی کی ترتیب سے قائم ہوتے ہیں لیکن ابواب کے حروف ان کے تحت درج ہونے والے الفاظ کے آخری حروف ہوتے ہیں۔ ہر باب مختلف فصلوں میں بھی منقسم ہوتا ہے جن کی ترتیب بھی حروف تہجی پر رکھی جاتی ہے اور ہر حرف کی فصل میں اسی حرف سے شروع ہونے والا لفظ درج ہوتا ہے۔ یعنی عربی لغت میں لفظ کا آخری حرف اس کا باب ہوتا ہے اور ابتدائی حرف اس کی فصل ہوتی ہے۔ ترتیب الفاظ میں سروں کی اہمیت نہیں ہوتی لیکن لسانی اصول کی رو سے لغت نگاری میں بھی سروں اور اسروں دونوں ہی کو اہمیت ملنا چاہئے، چنانچہ اس کی بہترین تقسیم وہ ہے جس میں ابواب کو اسروں سے اور فصول کو سروں سے قائم کیا جاتا ہے۔ اردو لغات کے لئے یہی تقسیم مناسب ہے۔

اندراج: لغت میں ہر کثیر المعنی لفظ کا ایک اندراج ہونا چاہئے اور مختلف المعانی لفظ کے ایک سے زیادہ اندراجات ہونا چاہئیں۔ اس بات کا فیصلہ کہ کون سا لفظ کثیر المعنی ہے اور کون سا مختلف المعانی ہے اس کے اشتقاق سے ہو گا۔ غالباً اس وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ غیر زبان کے ہم صورت الفاظ کا اندراج تو ہر حال میں الگ ہی ہو گا۔

رسم کتابت کے اختلاف کے باعث بھی بعض اوقات ایک ہی لفظ ایک سے زیادہ ہجوں کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ لغت نگار اس کی ہر املا کا ایک الگ اندراج قائم کرتے ہیں۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ لفظ کا پورا حال اس کی صحیح ترین املا کے اندراج میں لکھ دیا جائے اور دوسرے اندراجات میں اس کی طرف رجوع کرا دیا جائے۔

محاوروں، مقولوں اور کہاوتوں کا اندراج ان کے ابتدائی لفظ کے ہی ذیل میں ہونا چاہئے۔

تلفظ: ہر لفظ کا تلفظ بالکل ابتدا ہی میں دے دینا چاہئے۔ اس کے لئے خاص طریق کار اور علامات مقرر کر لینا چاہئیں تاکہ اس میں کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ اس میں شک نہیں کہ تلفظ آخر میں دئے ہوئے اشتقاق سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا الگ سے اہتمام ابتدا میں ہی ہو جانا چاہئے۔

معنی: لغت میں معنی لکھنے کے چار طریقے ہو سکتے ہیں:

۱۔ مترادفات یا قریب المعنی الفاظ   ۲۔ تعریف

۳۔ تصویر   ۴۔ ہجروپ

معنی نگاری کے پہلے طریقے میں اردو ہی کے یا بدیسی زبان کے ہم معنی اور قریب المعنی الفاظ لکھے جا سکتے ہیں۔ بیشتر لغات میں یہی طریقہ سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ بعض اوقات آسان سے لفظ کی تشریح بھی کر دی جاتی ہے لیکن اس میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ لغت تفصیلات کی کثرت سے کتاب العلوم نہ بن جائے۔ شناخت کرانے یا سمجھانے کے لئے بعض بعض الفاظ یعنی اشیاء وغیرہ کی تصویر دے دینا بھی اچھا ہوتا ہے لیکن ایسا کرنا ہمیشہ یا ہر لفظ کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ آخری طریقہ یہ ہے کہ صوتی تبادل کے اصولوں سے الفاظ کے ہجروپ بنا بنا کر لکھ دئے جائیں لیکن اس کے لئے عام لغات سے پہلے اشتقاقی لغات کی ضرورت پڑتی ہے۔

تمام لغات تو نہیں البتہ بعض بعض لغات میں الفاظ کے ہر معنی کے لئے اس کا جملے میں استعمال بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ معنی سمجھانے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے لیکن اس کا اہتمام صرف بڑے لغات میں ہی ہو سکتا ہے۔

اشتقاق: ہر لفظ کی تشریح کے آخر میں اس کا اشتقاق درج کرنا ضروری ہے۔ اس کے لئے لفظ کا تجزیہ کر کے اس کا مادہ، سابقہ، لاحقہ وغیرہ الگ الگ دکھانا چاہئے۔ دخیل الفاظ کے لئے ان کی زبان کی نشان دہی کر دینا ہی کافی ہے۔

عام طور پر مختلف زبانوں کے لغات میں لفظ کے گرامری منصب کی تشریح بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ بعض ماہرین لسانیات[۱] بھی ایسا کرنا ضروری سمجھتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ التزام بے فائدہ اور غیر ضروری ہے۔ اس کی صحیح جگہ گرامر کی کتاب میں ہے کیونکہ ہم لفظ کی گرامری حیثیت معلوم کرنے کے لئے لغت نہیں دیکھتے بلکہ لفظ کے معنی جاننے کے لئے لغت کھولتے ہیں۔

۱۔ ہیوارڈ میگی۔ سیمانٹکس ص ۱۰۶۔ اور اشونسل، آرٹکس آف لینگویج ص ۱۰۸۔

نظامیات

یہ لسانیات کا وہ شعبہ ہے جس میں جملوں کے باہمی تعلقات پر بحیثیت اجزائے کلام روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اسے انگریزی میں گرامر، عربی میں صرف و نحو، سنسکرت اور ہندی میں ویاکرن اور اردو میں قواعد کہتے ہیں لیکن یہ نام درست نہیں ہے کیونکہ قواعد قاعدے کی جمع ہے اور قاعدے صوتیات، لفظیات اور معنویات یعنی ہر شعبے میں ملتے ہیں اور بیان کیے جاتے ہیں اس لئے صرف موجودہ شعبے کو قواعد کا نام دینا غلط اور گمراہ کن ہے۔ اس کا بہتر نام نظامیات ہے جو اجزائے کلام کے باہمی روابط اور الفاظ اور جملوں کے نظام سے بحث کرتا ہے۔

بعض مغربی ماہرین لسانیات گرامر میں صوتیات، معنویات اور نحو کو شامل کرتے ہیں[1] چنانچہ اسمتھ اور ولسن کہتے ہیں کہ "گرامر کو چاہئے کہ زبان کے ہر جملے کو صحیح تلفظ اور معنی سے قریب رکھنے کا ذریعہ فراہم کرے"[2]۔ یہ لوگ دراصل گرامر اور زبان کو مترادف گردانتے ہیں چنانچہ آگے چل کر کہتے ہیں "زبان سیکھنا گرامر سیکھنا ہے۔ زبان جاننا گرامر جاننا ہے۔ بولنے والوں کی زبان کا فرق ان کی گرامر میں فرق ہوتا ہے۔ لسانی تبدیلی وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ گرامر کی تبدیلی ہوتی ہے اور خود زبان کی تعریف یہ ہے کہ وہ گرامر کے بیان کیے ہوئے جملوں کا مجموعہ ہوتی ہے"[3]۔ غرض یہ ہے کہ یہ لوگ بات گرامر کی کرتے ہیں اور اس سے مراد زبان لیتے ہیں یعنی ان کے نزدیک زبان اور گرامر ایک ہی چیز ہے۔

جان لیونز کہتا ہے کہ "لفظ گرامر میں بعض لوگ صرف لفظیات اور نحو کو شامل کرتے ہیں اور صوتیات اور معنویات کو اس سے خارج بتاتے ہیں اور کچھ لوگ صوتیات، لفظیات اور نحو کو اس میں شامل کرتے اور صرف معنویات کو اس سے باہر رکھتے ہیں اور اب بالکل ابھی قریب میں کر تو لفظ گرامر بہت وسیع معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے جس میں معنویات بھی شامل ہے"[4]۔

۱۔ فرینک پامر، گرامر، ص ۱۳۔
۲۔ اسمتھ اور ولسن، ماڈرن لنگوئسٹکس، ص ۱۹۔
۳۔ ایضاً، ص ۱۱۔
۴۔ جان لیونز، لنگوئسٹکس، ص ۱۳۳۔

عربی نظامیات میں بھی جس کو سامنے رکھ کر اردو زبان کی نظامیات پر کتابیں لکھی گئی ہیں صوتیات، لفظیات اور معنویات بھی کچھ شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں قدم قدم پر بناوٹ اور معنی کی بحث شامل ہے اور اجزائے کلام کی اسی نقطہ نظر سے تقسیم ہوتی رہتی ہے لیکن نظامیات کا معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نظامیات کو غیر معمولی اہمیت دینے والا خود نوام چومسکی کہتا ہے کہ گرامری لحاظ سے بالکل صحیح جملہ بھی مہمل ہو سکتا ہے مثلاً "بے رنگ سبز خیالات غضب ناک حالت میں سوتے ہیں"[1]۔

وہ مزید واضح الفاظ میں کہتا ہے "نحوی خیالات کی معنوی الفاظ میں تعریف کرنے کی مبینہ ضرورت سے متعلق ہر واضح نظریے کی تدوین کے غلط نتائج نکلے ہیں۔ ان سوالات کے بارے میں غور کرنے کا جو نتیجہ نکلا اسے آگے چل کر نحوی خود مختاری کے نظریے کا نام دیا گیا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ نحوی اجزا معنوی بنیادوں پر قائم نہیں ہیں اور ایک بار ان کی تعمیر ہو جانے کے بعد نحوی کاروبار گرامر کے دوسرے مشمولات سے جو تعمیراتی مشمولات ہیں، آزادانہ چل رہا ہے"۔

نظامیات کی معنویات سے جداگانہ حیثیت کے متعلق مزید ثبوت بھی ملتے ہیں۔ نظامیات کا تعلق جنس، عدد، فاعل اور زمانے جیسے درجات سے ہے۔ ان میں لفظی اور معنوی اعتبار سے اختلافات ملتے ہیں۔ جس طرح چومسکی کا گرامری لحاظ سے صحیح اور معنوی لحاظ سے مہمل جملہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے اردو کی کچھ اور مثالیں یہ ہیں:

چڑیاں سمندر کی تہ میں رہتی ہیں
پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے اس بھینس کے انڈے میں ڈال
ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں
مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں

اسی طرح معنوی لحاظ سے صحیح اور لفظی لحاظ سے غلط جملے یہ ہیں:

۱۔ لڑکے باغ میں کھیلتا ہے۔
۲۔ مرغیاں صبح کے وقت چہچہاتا ہے۔
۳۔ بے پورب نکلتا ہے سورج۔

ان میں سے پہلے جملے میں ایک گرامری غلطی ہے۔ دوسرے میں دو غلطیاں ہیں اور تیسرا جملہ گرامری

۱۔ ۲۔ لینگویج اینڈ ریسپانسبلٹی، ص ۳۰۔

لحاظ سے یکسر غلط ہے۔

اسی طرح گرامری اور معنوی عدد میں اختلاف ملتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

الف: ۱۔ باجرہ بِک گیا۔

۲۔ گیہوں پسنے گئے ہیں۔

ب: ۳۔ مرد آگئے۔ مرد آگیا۔

۴۔ بیل بھوکا کھڑا ہے۔ بیل بھوکے کھڑے ہیں۔

ج: ۵۔ مکان کے کیا دام لگے؟

۶۔ اس جملے کے معنی واضح نہیں ہیں۔

پہلے جملے میں اسم باجرا بہت سے دانوں کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی اپنے روپ کے لحاظ سے واحد ہے اور فعل بھی واحد رکھتا ہے لیکن دوسرے جملے کا اسم گیہوں دانوں کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی روپ کے لحاظ سے واحد اور فعل کے لحاظ سے جمع ہے۔ تیسرے اور چوتھے نمبر کے جملوں میں مرد اور بیل کے اسم روپ کے لحاظ سے واحد ہیں لیکن افعال کے لحاظ سے واحد بھی ہیں اور جمع بھی یعنی ان کے صحیح عدد کا علم ان کے افعال سے ہوتا ہے۔ پانچویں اور چھٹے جملے میں دام اور معنی کے گرامری روپ واحد ہیں لیکن معنوی اعتبار سے جمع ہیں جیسا کہ ان کے افعال سے ظاہر ہو رہا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گرامری عدد معنوی عدد سے مختلف بھی ہوتا ہے۔

اسی طرح معنوی اور گرامری جنس میں اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ اردو میں بے جان چیزیں بھی مذکر اور مونث ہوتی ہیں۔ سالن مذکر اور مچھلی مونث۔ گھر مذکر ہے اور گاجر مونث۔ آنت مونث ہے اور پیٹ مذکر۔ پھر بڑی چیز مذکر ہوتی ہے اور چھوٹی چیز مونث۔ پانی مذکر ہے اور بوند مونث۔ جھاڑ مذکر ہے اور جھاڑو مونث۔ اس تذکیر و تانیث میں کسی لاحقے سابقے یعنی گرامری روپ کا بھی کوئی دخل نہیں ہے۔ پھر بعض جاندار صرف مذکر بولے جاتے ہیں گویا ان میں مادہ ہی نہیں ہوتی مثلاً مچھر، کھٹمل، چیتا، الو، کوا، لوڑو (؟)، ہدہد وغیرہ۔ بعض صرف مونث بولے جاتے ہیں گویا ان میں نر کا وجود ہی نہیں ہے۔ مثلاً چمگادڑ، چیل، لومڑی، فاختہ، قاز، جوں، دیمک، گوہ، مینا، قرد، اسٹ وغیرہ۔

اردو کی طرح فرانسیسی زبان میں بھی بے جان اشیاء کی تذکیر و تانیث ہوتی ہے۔ انگریزی میں بھی اگرچہ جاندار اور بے جان کی تین قسمیں مذکر، مونث اور بے جان ہوتی ہیں لیکن اس میں بھی سورج مذکر اور چاند مونث ہے اور پانی کا جہاز بھی مونث ہے۔ دوسری طرف سانپ کے لئے بے جان

کی ضمیر "اٹ" (it - یا) بولی جاتی ہے اور جس شیر خوار بچے کی جنس کا علم نہیں ہوتا اس کے لئے بھی بے جان کی ہی ضمیر استعمال ہوتی ہے۔

یہی حال زمانے کا ہے یعنی حقیقی اور گرامری زمانے ایک نہیں ہوتے۔ ہم مستقبل کے لئے ماضی کا استعمال کرتے ہیں جیسے اگر وہ کل آگیا تو میں بھی اس کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا۔ ماضی کے لئے حال بول جاتے ہیں بلکہ کہانی میں تو اکثر بولتے ہیں اور اسے تاریخی حال کہتے ہیں جیسے "اسلئے میں ہمسایہ بھی وہاں آجاتا ہے جہاں لڑکا کھیل میں مشغول تھا۔" مستقبل کو ماضی میں اور ماضی کو مستقبل میں استعمال کرنے میں فرانسیسی کی طرح بہت کم زبانیں ہاتھ بٹاتی ملیں گی۔[1]

اسی طرح معنوی اور گرامری فاعل بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔[2] مثلاً

(معروف) بلی نے چوہا پکڑا۔

(مجہول) بلی سے چوہا پکڑا گیا۔

ان جملوں میں معنوی فاعل بلی اور گرامری فاعل چوہا ہے کیونکہ فعل اپنے عدد اور جنس میں اپنے فاعل سے مطابقت رکھتا ہے۔

یہ دلیلیں ثابت کرتی ہیں کہ نظامیات کا معنویات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زبان لفظ ہے۔ صوتیات کا شعبہ ان بنیادی آوازوں سے بحث کرتا ہے جن سے لفظ بنتا ہے۔ لفظیات لفظ سے لفظ بنانے کے طریقے اور اصول بتاتا ہے۔ معنویات لفظ اور معنی کا تعلق دکھاتا ہے اور نظامیات کا شعبہ لفظ سے لفظ کے، لفظ سے جملے کے اور جملے سے جملے کے باہمی رابطے کو موضوعِ بحث بناتا ہے۔ بقول بے۔ آر۔ فرتھ نظامیات یا گرامر اجزائے کلام کے باہمی تعلقات کا نام ہے جو زبان کی حقیقی اکائیاں ہیں۔[3] ایڈورڈ سپیئر (؟) کہتا ہے کہ "نحو جملے میں الفاظ کی ترتیب کا نام ہے"[4] اور "گرامر کلام کے غیر مرتب مواد کی ذہنی تعمیر و ترتیب کو کہتے ہیں"۔[5]

جملے کی منطقی تعریف یہ ہے کہ اس میں ایک مسند الیہ اور ایک مسند ہوتا ہے یعنی ایک تو وہ شے ہوتی ہے جس کے بارے میں کچھ کہا جاتا ہے اور دوسرے وہ ہوتا ہے جو اس شے کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ مسند الیہ اسم، صفت اور ضمیر میں بٹ جاتا ہے اور مسند فعل اور متعلق فعل میں تقسیم ہو جاتا ہے اور حروف اور حروف عطف ودیگر لفظوں یا دو جملوں میں ربط پیدا کرتے ہیں۔ ان کا تجزیہ یوں بنتا ہے:

۱۔ [illegible] لنگویج ص ۹۰۔

۲۔ [illegible] ان لنگوئسٹکس ص ۲۱۲۔

۳۔ ایضاً ص ۱۲۵۔

۴۔ [illegible] لنگوئسٹکس ص ۱۰۱۔

۵۔ آسپکٹس آف لنگویج ص ۲۳۔

جملہ

مسند الیہ — عوامل و عواطف — مسند

اسم — صفت — ضمیر — فعل — متعلق فعل

چنانچہ قواعد نگاروں نے لسانیات کے دو حصے کر دیے ہیں:

۱۔ صرف — جو اسم، صفت، ضمیر، عدد اور جنس جیسے درجات پر مشتمل ہے۔

۲۔ نحو — جو لفظ اور جملے کے تعلقات یعنی فاعل، فعل اور حالت وغیرہ سے بحث کرتا ہے۔

یوں تو تقریباً ہر زبان میں ایک لفظ کا جملہ بھی ہوتا ہے اور مکمل ہوتا ہے جیسے امر کہتے ہیں جیسے چل (تو چل) لیکن بیشتر جملوں میں ایک اسم اور ایک فعل ضرور ہوتا ہے اور کبھی کبھی عامل اور علیحدہ بھی استعمال کر لیے جاتے ہیں جنھیں اردو قواعد نگاروں کی کتابوں میں عربی کی دیکھا دیکھی حروف کہا جاتا ہے حالانکہ وہ حرف نہیں پورے پورے لفظ ہوتے ہیں۔ اسم اشیا، اشخاص اور خیالات کے نام کو کہتے ہیں۔ فعل عمل و حرکت ظاہر کرتا ہے اور عامل یا علیحدہ اجزائے کلام کو ملاتا ہے۔

اسم:

اسم کے متعلق گلکرسٹ نے رسالہ گلکرسٹ میں لکھا ہے "اسم وہ کلمہ ہے کہ دلالت کرے ایک معنی پر ساتھ استقلال کے، یعنی دلالت کے واسطے محتاج دوسرے کی طرف نہ ہو اور اس کے معنی کے ساتھ زمانہ معتبر نہ ہو"۔ پھر انھوں نے باب اول میں اشتقاق اور عدم اشتقاق کے لحاظ سے اسم کی تین قسمیں کر دی ہیں۔ جامد، مصدر اور مشتق۔ مولوی فتح محمد خاں جالندھری نے بھی اپنی کتاب مصباح القواعد میں لکھا ہے "اسم وہ کلمہ ہے جو اکیلا اپنے معنی دے اور اس میں کوئی زمانہ نہ پایا جائے" اور پھر بناوٹ کے لحاظ سے اسم کی یہی تین قسمیں گنائی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب "قواعد اردو" میں اسم کی تعریف یوں کی ہے "اسم وہ لفظ ہے جو کسی جاندار یا شے کی کیفیت کا نام ہو"۔ انھوں نے بناوٹ کے لحاظ سے اسم کی قسمیں کرنے یا گنانے کا جھگڑا ہی نہیں پالا۔

گلکرسٹ جامد کی تعریف میں لکھتے ہیں "جامد وہ اسم ہے کہ نہ وہ مشتق ہے نہ وہ مشتق منہ ہے یعنی نہ نکلا ہے وہ کسو سے نہ اس سے کوئی نکلا ہے جیسا پتھر، ہاتھی، مرد، رنڈی"۔ مولوی فتح محمد خاں کہتے

ہیں "جس سے کوئی دوسرا لفظ نہ نکلے اور نہ وہ کسی سے نکلتا ہے جیسے ہاتھی، گھوڑا، چاقو، قلم، ڈھال، تلوار"۔ اب ان بولوں پر دھیان دیجئے تو یہ بات کھلتی ہے کہ پتھر، ہاتھی، رنڈی، گھوڑا اور تلوار کے الفاظ نہ صرف پتھ (پاتھ)، ہاتھ، رنڈ، گھوڑ (گھوم) اور تل سے بنے ہیں جو ہماری بولی کی جڑیں یا دھاتیں ہیں اور ڈھال بھی ایک جڑ ہے، بلکہ ان سے پتھرو، پتھری، پتھریلا، پتھراؤ، ہتھنی، ہتھیانا، ہتھیا لینا، گھڑدوڑ، گھڑ چڑھی، ڈھلیت، تل تلا اور تلوریا کے بول بھی بنتے ہیں۔ مرد اور چاقو فارسی کے بول ہیں اور قلم عربی کا اس لئے یہ مثالیں اس وقت ہمارے بحث سے باہر ہیں۔ اس طرح یہ سب کے سب بول یا تو کسی اور بول سے بنے ہیں یا ان سے دوسرے بول گھڑے گئے ہیں اس لئے جامد کی تعریف پر پورے نہیں اترتے اور انھیں پر کیا موقوف ہے۔ جامد کی تعریف پر پورے اترنے والے اسم تو پوری اردو زبان میں نہیں ملتے۔

اردو میں ایسے اسم نہیں جو کسی سے نکلے ہیں اور نہ ان سے کوئی دوسرا لفظ نکلتا ہے۔ ان کا ذکر "باب لفظیات" میں کیا جا چکا ہے۔

اسم کی دوسری قسم مصدر بتائی گئی ہے جس کی تعریف میں گلکرسٹ لکھتے ہیں "مصدر وہ اسم ہے کہ نکلیں اس سے افعال اور اسمائے مشتقہ" اور یہ بھی کہتے ہیں کہ "علامت مصدر کی ہندی میں حرف نا ہے یعنی نون و الف ساکن"۔ مولوی فتح محمد خاں مصدر کی تعریف یوں کرتے ہیں "جس سے اور الفاظ نکلیں جیسے کھانا سے کھایا۔ کھاؤ۔ ہم کھائیں گے۔ وہ کھاتے ہیں۔ تم نہیں کھاتے وغیرہ"۔ لیکن مولوی عبدالحق "لوازم فعل" میں مصدر کو فعل کی ایک صورت بتاتے ہیں اور اس کی تعریف میں لکھتے ہیں "جس میں کام کا ہونا بلاتعین وقت کے ہو۔ اس کے آخر میں ہمیشہ نا ہوتا ہے جیسے ہونا، کرنا، کھانا۔ حقیقت میں یہ ایک قسم کا فعلی اسم ہے جو تجریدی طور پر فعل کے کام یا حالت کو بتاتا ہے اور زمانہ اور تعداد سے بری ہوتا ہے"۔

گلکرسٹ اور مولوی فتح محمد خاں دونوں کی تعریف بتاتی ہے کہ مصدر سے دوسرے بول نکلتے ہیں اور عربی میں بھی نکلنے کی جگہ کو "مصدر" کہتے ہیں لیکن اردو میں یہ بات ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ کیونکہ ہمارے یہاں کوئی بول کسی مصدر سے نہیں نکلتا۔ اوپر کی مثالوں میں مولوی فتح محمد خاں نے جتنے بول یا فعل دیے ہیں وہ "کھانا" سے نہیں "کھا" سے نکلے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی "نا" تو کیا خالی "ن" بھی نہیں ملتا جبکہ "نا" اردو مصدر کا ایک ضروری جزو

دہلی کے ایک درخت کا نام۔

بتایا جاتا ہے۔ اردو میں جس بول کو مصدر کہتے ہیں وہ خود ایک اور بول سے نکلتا ہے جسے ہم جڑ یا امر کہتے ہیں۔ ہونا، کرنا، کھانا، پینا کے الفاظ ہو، کر، کھا، پی کی جڑوں پر "نا" بڑھا کر بنائے گئے ہیں اور پھر ان سے آگے اور کوئی بول نہیں بنتا۔

اس جگہ مولوی عبدالحق نے ٹھیک کہا ہے کہ "مصدر کی علامت 'نا' گرا دینے سے فعل کا مادہ رہ جاتا ہے اور اس سے باقاعدہ افعال بنتے ہیں مثلاً ملنا کا مادہ مل ہے اور چلنا کا چل۔ ہندی فعل کا مادہ صورت میں امر کا طالب کا مطابق ہوتا ہے"۔ مولوی فتح محمد خاں کا دھیان بھی اس بات کی طرف گیا ہے اس لئے وہ لکھتے ہیں "امر یہ اعلیٰ مادہ پکار رہا ہے کہ اصل اشتقاق میں ہوں کیونکہ مجھ سے مضارع، حال، استقبال، اسم فاعل، اسم حالیہ متعدد صیغے مشتق ہوتے ہیں" لیکن اس کے بعد ہی وہ پھر پرانے خیال کی طرف پلٹ جاتے ہیں اور لکھتے ہیں "مگر جس طرح امر سے یہ صیغے بن جاتے ہیں اسی طرح مصدر سے علامت مصدر کے حذف کرنے سے یہ صیغے نکل آتے ہیں۔ اس لئے ہم بھی اردو میں مصدر ہی کو اصل اشتقاق قرار دیتے ہیں"۔

سچی بات یہ ہے کہ اردو میں نام نہاد مصدر کے بس دو ہی روپ بولے جاتے ہیں۔ جانا اور جانے۔ چلنا اور چلنے۔ ان میں سے پہلا فاعلی اور دوسرا غیر فاعلی ہے جیسے ٹہلنا اچھی عادت ہے اور ٹہلنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کا کوئی تیسرا روپ ہمارے یہاں نہیں بولا جاتا اور نہ اس سے دوسرے بول ہی بنتے ہیں اس لئے اسے مصدر (نکلنے کی جگہ۔ منکاس) کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی جگہ فعلی جڑ یعنی امر کو مصدر کہنا مناسب ہے کیونکہ اردو کے سب فعلی روپ امر سے ہی نکلتے ہیں۔

مشتق کی تعریف رسالہ گلکرسٹ میں یہ لکھی ہے "مشتق وہ اسم ہے کہ نکلے مصدر سے" اور مصباح القواعد میں لکھا ہے "جو کسی اور کلمے سے نکلا ہو جیسے لکھنے والا (اسم فاعل)، لکھا ہوا (اسم مفعول) وغیرہ لکھنے سے مشتق ہیں" لیکن افضل القواعد میں مولوی فتح محمد خاں نے اسی بات کو وضاحت سے یوں لکھا ہے "مشتق وہ جو مصدر سے بنا ہو" اور مثال میں آنے والا، جانے والا، لکھا ہوا، پڑھی ہوئی، چلتے پھرتے، دیکھنے والی، سونگھتا ہوا کے بول پیش کئے ہیں جن میں سے آنے والا، جانے والا اور دیکھنے والی کے بول مرکب ہیں۔ یہ اکہرے بول نہیں ہیں بلکہ وہ دو آزاد بولوں سے مل کر ایسے ہی بنے ہیں جیسے گاڑی والا، گھوڑے والا، گھر والا۔ لکھا ہوا، پڑھی ہوئی، چلتے پھرتے اور سونگھتا ہوا کے بول لکھ، پڑھ، چل، پھر اور سونگھ سے نکلے ہیں۔ انھیں لکھنا، پڑھنا، چلنا، پھرنا اور سونگھنا سے مشتق کہنا غلطی ہے کیونکہ اردو مصدر کی پہچان "نا" بتائی گئی ہے جس کا نشان ان بولوں میں دور دور تک نہیں ملتا۔

ان تعریفوں اور مثالوں کو پرکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو میں جامد جیسا اسم تو سرے سے ملتا ہی نہیں۔ رہا مصدر تو اس کی تعریف اور مثالوں میں مطابقت نہیں ہے۔ اگر اس کی تعریف ٹھیک کہہ لی جائے تو مثالیں غلط ٹھہرتی ہیں اور جو مثالوں کو ٹھیک مان لیا جائے تو تعریف غلط ہو جاتی ہے اور مشتق کی جو مثالیں دی گئی ہیں انھیں اس روپ سے مشتق نہیں مانا جا سکتا جسے آج کل اردو کا مصدر کہتے ہیں۔ اس طرح بناوٹ سے اردو کے اسم کی جو تین قسمیں بتائی گئی ہیں وہ سب کی سب غلط سلط دکھائی دیتی ہیں۔

معنی کے لحاظ سے گلکرسٹ نے اسم کی دو قسمیں گنائی ہیں۔ نکرہ اور معرفہ اور معنی کے لحاظ سے یہی دو قسمیں مولوی فتح محمد خاں نے افضل القواعد میں لکھی ہیں لیکن مصباح القواعد میں انھوں نے معرفہ اور نکرہ کو اسم جامد کی قسمیں لکھا ہے جو بہت ہی غلط ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اپنی کتاب میں معرفہ اور نکرہ کا ذکر کیا ہے اور انھیں اسم خاص اور اسم عام کا نام دیا ہے۔ گلکرسٹ نے معرفہ کی پھر چار قسمیں لکھی ہیں۔ علم، ضمیر، اسم اشارہ اور اسم موصول۔ مولوی فتح محمد خاں نے بھی معرفہ کو اسی طرح بانٹا ہے لیکن مولوی عبدالحق نے اسم خاص (معرفہ) کی ایسی کوئی تقسیم نہیں لکھی اور یہ اچھا ہی کیا کیونکہ اسم اشارہ اور اسم موصول ایک ضمیر ہی کی قسمیں ہیں اور ضمیر اس لفظ کو کہتے ہیں جو اسم نہیں ہے بلکہ اسم کی جگہ بولا جاتا ہے۔ میں، ہم، تو، تم کسی کے نام نہیں ہیں ناموں کی جگہ بولے جانے والے الفاظ ہیں۔ اس لئے انھیں اسم نہیں کہا جا سکتا اور ضمیر کو اسم کی قسم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گلکرسٹ اور مولوی فتح محمد خاں کی یہ تقسیم بھی غلط ہے۔

گلکرسٹ نے علم کی تعریف یوں لکھی ہے "علم وہ ہے کہ نام ہو ایک شخص معین کا" اس تعریف سے لاہور اور تاج محل علم کے تحت نہیں آتے اور نہ باقی تین قسموں ضمیر، اسم اشارہ اور اسم موصول میں ہی گنے جا سکتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر انھیں کس درجے میں رکھیں اور اسم معرفہ کیونکر کہیں۔ مولوی فتح محمد کا کہنا ہے کہ "اسی طرح لوگ سب چیزوں کے نام رکھ لیتے ہیں اور سب علم ہیں" اور علم کی مثالوں میں انھوں نے حامد، محمود اور احمد کے ساتھ ساتھ گنگا، جمنا، چاند اور سورج کے بول بھی لکھے ہیں یعنی ان کے کہنے کے مطابق یہ سب علم ہیں لیکن انھوں نے علم کی نرالی پانچ قسمیں ہی کی ہیں۔ خطاب، لقب، کنیت، عرف اور تخلص۔

اب الجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ گنگا اور سورج کو علم کی کس قسم میں رکھا جائے اور ولدیت احمد کو کس قطار میں شمار کیا جائے۔ اس گڑبڑ کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے سیدھے سادے نام کے لئے کوئی

الگ قسم ہی نہیں رکھی۔ مولوی عبدالحق نے بھی لکھا ہے کہ اشخاص کے اسم خاص (معرفہ) بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور ان قسموں کو خطاب، لقب، عرف اور تخلص کہا ہے۔ لیکن انھوں نے بھی سیدھے سادے خاص نام جیسے احمد، حامد، محمود، سرگودھا اور کراچی کے لئے کوئی الگ قسم مقرر نہیں کی اور پھر دوسروں کی بیان کی ہوئی قسموں میں سے کنیت بھی اڑا گئے جبکہ ہمارے یہاں منو کی ماں اور بیو کے ابا جیسے مرکبات بھی بولے جاتے ہیں جو عربی کے ابوالحسن (حسن کے باپ) اور ام المومنین (مومنین کی ماں) جیسے مرکبات کے برابر ہیں اس لئے جہاں انھوں نے علم کی چار قسمیں مان لی ہیں وہاں پانچویں (کنیت) بھی مان لینا چاہئے تھا۔

گلکرسٹ نے اسم نکرہ کی کوئی قسم نہیں لکھی۔ مولوی عبدالحق نے اسم عام (یعنی نکرہ) کو تین قسموں میں رکھا ہے۔ عام نام، اسم کیفیت اور اسم جمع۔ اس تقسیم میں دو قسمیں تو ٹھیک لگتی ہیں لیکن تیسری قسم (اسم جمع) بیکار ہے جسے عام نام کے تحت ہی رکھا جا سکتا تھا کیونکہ فوج، انجمن، قطار اور جھنڈ چاہے کتنے ہی آدمیوں کی گنتی کے لئے بولے جائیں اردو میں واحد ہی بولے سمجھے جاتے ہیں اور سمجھے جائیں گے ورنہ پھر ان میں بول اور جملے کو بھی ملانا پڑے گا کیونکہ بول آوازوں کا اور جملہ بولوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جوڑا دو آدمیوں یا چیزوں کا ہوتا ہے۔ درجن بارہ کی، کوڑی بیس کی اور سینکڑا سو کی ڈھیری کو کہتے ہیں لیکن جوڑا، درجن، کوڑی اور سینکڑا کے بول واحد ہی بولے جاتے ہیں اس لئے مولوی صاحب اسم نکرہ کو خالی دو قسموں میں بانٹ کر مادی اور مجرد یا خیالی کے نام دے دیتے تو ٹھیک ہوتا۔

مولوی فتح محمد خاں نے اسم نکرہ کی دس قسمیں گنائی ہیں۔ اسم ذات، اسم کنایہ، اسم استفہام، اسم صفت، مصدر، حاصل مصدر، اسم فاعل، اسم مفعول، اسم معاوضہ اور اسم حالیہ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ مصدر کو جامد سے الگ بھی ایک اسم مانتے ہیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور اب اس بانٹ میں اسے جامد کی ایک قسم بھی منوا رہے ہیں کیونکہ وہ نکرہ کو جامد کی ہی قسم ٹھیراتے ہیں یعنی وہ مصدر کو جامد کا بھائی بھی مانتے ہیں اور اس کا بیٹا بھی گرداتے ہیں۔ حاصل مصدر، اسم فاعل، اسم مفعول، اسم معاوضہ اور اسم حالیہ کو نکرہ کی قسمیں بتاتے ہیں اور مصدر کے مشتقات میں بھی گناتے ہیں۔ کنایہ، استفہام اور صفت کو کسی آدمی، چیز یا جگہ کا نام نہ ہونے پر بھی اسم کہتے ہیں۔ اسم ذات کی پانچ قسمیں اسم آلہ، اسم ظرف، اسم صوت، اسم مصغر اور اسم مکبر بتاتے ہیں اور اسم آلہ میں دھونکنی، چھلنی، بیلن، چھلنی اور تکیہ جیسے نام بھی لکھتے ہیں جن کی گنتی مشتقات میں ہونا چاہئے اور مشتقات میں ہی اسم مصغر اور اسم مکبر کو رکھنا چاہئے۔ اسم ظرف کی مثال میں گھر، گلی، گاؤں، شہر، ملک، صبح، شام،

رات اور دن کے بول لکھتے ہیں جو عام نام ہیں۔ انھیں وقت اور جگہ کی ایک الگ قسم میں رکھنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ غضب یہ ہے کہ مولوی صاحب ان کے ساتھ ساتھ جہاں اور جب کے الفاظ کو بھی اسم ظرف کہتے ہیں جبکہ یہ کسی کے نام نہیں ہیں۔

اسم کی تعریف، اقسام اور امثال میں جتنے اشکالات اوپر بیان کئے گئے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ اردو گرامر کی کتابوں میں اسم کی تقسیم دو طرح سے کی گئی ہے۔ ایک بناوٹ سے دوسرے معنی سے جبکہ نظامیات (گرامر) میں بناوٹ اور معنی سے بحث نہیں ہونا چاہئے۔ بناوٹ کا ذکر لفظیات اور معنی پر غور معنویات میں ہو سکتا ہے۔ نظامیات میں جملے کے الفاظ کی ترتیب و تعلق کی بات ہوتی ہے اس لئے اسم کی تقسیم تصریف کی رو سے ہونا چاہئے اور وہ یہ ہے۔

اسم کی دو بڑی قسمیں غیر منصرف اور منصرف ہیں۔

١۔ غیر منصرف اسم واحد بولے جاتے ہیں۔ ان کا امالہ نہیں ہوتا اور یہ فاعلی یا غیر فاعلی کسی حالت میں نہیں بدلتے جیسے ملتان، نتھوا، تیج گل، احمد، دادا، نانا، تایا، چچا وغیرہ۔

٢۔ منصرف اسما واحد اور جمع دونوں طرح بولے جاتے ہیں۔ ان کا امالہ ہوتا ہے یعنی جب ان کے بعد کوئی حالی آجاتا ہے تو اسما کا لاحقہ "ا" سے "ے" میں بدل جاتا ہے جیسے (لڑکا) لڑکے نے (گھوڑا) گھوڑے پر (باڑا) باڑے میں وغیرہ۔ ان کی جمع غیر فاعلی آخر میں "وں" کا لاحقہ بڑھا کر بنائی جاتی ہے جیسے بیل، لڑکا اور لڑکی سے بیلوں، لڑکوں اور لڑکیوں۔

منصرف اسما کی دو مزید قسمیں مذکر اور مونث ہو جاتی ہیں۔

١۔ مونث یہ اسما مادہ کے لئے بولے جاتے ہیں اور فاعلی اور غیر فاعلی دونوں حصوں میں روپ بدلتے ہیں جیسے لڑکی، عورت اور گائے سے لڑکیاں، لڑکیں، لڑکیوں، عورتیں، عورتوں، گائیں اور گایوں۔ ان کی پھر دو اور قسمیں ہو جاتی ہیں۔

الف۔ قوی، اس اسم مونث کے آخر میں "ای" کی آواز نکلتی ہے اور اس کی جمع "یں" اور "ایں" دونوں لاحقوں سے بنتی ہے جیسے لڑکی سے لڑکیاں اور لڑکیں۔ گھوڑی سے گھوڑیاں اور گھوڑیں۔

ب۔ ضعیف، اس اسم مونث کے آخر میں "ای" کے علاوہ اور کوئی آواز ہوتی ہے۔ اس کی جمع "ایں" کے لاحقے سے بنتی ہے جیسے میز سے میزیں، عورت سے عورتیں، بیوا سے بیوائیں، بہو سے بہوئیں، ماں سے مائیں۔

۲۔ مذکر: یہ اسما نر کے لئے بولے جاتے ہیں۔ ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

الف۔ قوی: اس اسم مذکر کے آخر میں "ا" کی آواز نکلتی ہے۔ اس کے واحد فاعلی، جمع فاعلی اور جمع غیر فاعلی روپ الگ الگ ہوتے ہیں یعنی واحد سے جمع بناتے وقت آخری آواز "ا" کو "اے" سے بدل دیتے ہیں جیسے لڑکا سے لڑکے، گھوڑا سے گھوڑے، مسئلہ سے مسئلے، مقدمہ سے مقدمے۔

اس کے علاوہ جب اس اسم کے آخر میں کوئی عامل جیسے کو، پر، میں وغیرہ آجاتا ہے تو اس کا امالہ ہو جاتا ہے یعنی اس کی آخری آواز "ا" سے "اے" ہو جاتی ہے جیسے بچا سے بچے کو، نوالہ سے نوالے میں، روٹھا سے روٹھے کو (متاثر) وغیرہ۔ لاحقے سے بھی ہوتا ہے جیسے لکھنا سے لکھنے والا، رشتہ سے رشتے دار وغیرہ۔

ب۔ ضعیف: اس اسم مذکر کی آخری آواز "ا" کے علاوہ کوئی اور ہوتی ہے۔ اس کا واحد فاعلی اور جمع فاعلی روپ ایک ہی ہوتا ہے جیسے ایک مرد آیا۔ دس مرد گئے۔ ایک بیل بھوکا ہے۔ پانچ بیل بھوکے ہیں۔ اس کی پھر دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔

۱۔ اک عددی: اس اسم مذکر کا فاعلی روپ تو واحد ہوتا ہے لیکن وہ جمع میں بولا جاتا ہے جیسے معنی (اس لفظ کے معنی لغت میں دیکھو)۔ دام یعنی قیمت (آج کل ہر چیز کے دام بڑھ گئے ہیں)۔

۲۔ دو عددی: یہ اسم مذکر واحد اور جمع دونوں طرح بولا جاتا ہے جیسے یہ پل اچھا ہے۔ یہ پل اچھے ہیں۔ اس کا ہاتھ لمبا ہے۔ اس کے ہاتھ لمبے ہیں۔

نیچے اسم کی تقسیم کا نقشہ دیا جاتا ہے۔

- اسم
  - غیر منصرف (جیسے ماں، تکیا)
  - منصرف (جیسے لڑکی، میز، گھوڑا، بیل)
    - مذکر
      - قوی
      - ضعیف
        - اک عددی
        - دو عددی
    - مونث
      - قوی
      - ضعیف

اسم کی خصوصیات:

اس کی تین خصوصیات ہوتی ہیں۔ عدد، جنس اور حالت۔

عدد

بعض زبانوں میں اسم کے لئے صرف دو عدد ہوتے ہیں۔ ایک کے لئے واحد اور ایک سے زیادہ کے لئے جمع۔ ان زبانوں میں انگریزی، جدید یونانی، ارمنی، لاطینی، پہلوی، فارسی، پالی اور پراکرت کا شمار ہے اور اردو میں بھی یہی دو عدد پائے جاتے ہیں۔ قدیم یونانی، آئرش، ویدک، سنسکرت، قدیم سلاوی، قدیم فارسی، ژنڈ[1] اور عربی میں تین عدد ہوتے ہیں۔ واحد (ایک)، تثنیہ (دو) اور جمع (دو سے زیادہ)۔ فجی اور ٹنگسے (انڈونیشیا) کی زبانوں میں چھوٹی اور بڑی جمع کا امتیاز بھی ملتا ہے جس سے چار عدد بن جاتے ہیں یعنی واحد، تثنیہ، چھوٹی جمع، بڑی جمع[2]۔

اسم کی ایک اور خصوصیت گنتی کے ساتھ ساتھ حجم یا مقدار بھی ہونا چاہئے۔ مثلاً کتا، بلی شماری اسما ہیں جیسے ایک کتا دو کتے۔ ایک بلی دو بلیاں۔ لیکن گھی، تیل مقداری اسما ہیں۔ ہم ایک گھی دو تیل نہیں کہہ سکتے البتہ اردو میں حجم یا مقدار کو بھی واحد اور جمع میں ہی استعمال کر لیتے ہیں۔ چنانچہ صابن، بھاپ، شکر، تیل، پانی، کھیر، مکھن، پنیر، دودھ، دہی، برف، کہرا اور معدنیات میں لوہا، تانبا، سونا، چاندی وغیرہ واحد بولے جاتے ہیں۔ ہوا، گیہوں، دھن، چنا، ہیرا، پکھراج، لال وغیرہ کے اسما واحد اور جمع دونوں عددوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

اردو میں عدد ظاہر کرنے کے چند مختصر سے قاعدے ہیں۔ ان میں سے کچھ بناوٹ سے اور کچھ چلن سے تعلق رکھتے ہیں۔

الف۔ بناوٹ

۱۔ اردو میں واحد سے جمع بنتی ہے۔

۲۔ مذکر اسما کے آخری "ا" کو "اے" سے بدل دیتے ہیں جیسے لڑکا سے لڑکے، بیٹا سے بیٹے۔

۳۔ کچھ رشتوں کے ناموں یا خطابات اور القاب کا آخر "ا" واحد اور جمع دونوں حالتوں میں قائم رہتا ہے جیسے تایا، نانا، دادا، چچا، راجا، ملّا۔

۱۔ بے ویڈرے۔ لینگویج ص ۹۸۔ ۲۔ واجس۔ جنرل لنگوئسٹکس ص ۲۲۳ ۳۔ پامر۔ ... ص ۲۲۔

۴۔ جن مذکر اسما کا خاتمہ "ا" پر نہیں ہوتا وہ واحد اور جمع دونوں صورتوں میں ایک ہی رہتے ہیں جیسے ایک کھیت کٹ گیا۔ سب کھیت کٹ گئے۔ ان اسما کے عدد کا حال افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عدد اور جنس میں فاعل سے مطابقت رکھتے ہیں۔

۵۔ مذکر اسما کے آخر میں آنے والا نون غنہ گرا کر "ایں" کا اضافہ کر دیتے ہیں جیسے دھواں (دھوں آ) سے دھوئیں (دھوں ایں)۔ کنواں (کنوں آ) سے کنوئیں (کنوں ایں)۔ رواں (روں آ) سے روئیں (روں ایں) وغیرہ۔

۶۔ مونث اسما کی جمع بنانے کا عام لاحقہ "ایں" ہے جیسے میز سے میزیں، بھینس سے بھینسیں، لڑکی سے لڑکیاں، گھوڑی سے گھوڑیاں، ماں سے مائیں، خالہ سے خالائیں اور جن مونث اسما کے آخر میں "ی" کا لاحقہ آتا ہے ان پر "اں" کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں جیسے لڑکی سے لڑکیاں، گھوڑی سے گھوڑیاں، مرغی سے مرغیاں۔

۷۔ جن مونث اسما کا خاتمہ "یا" پر ہوتا ہے ان کا آخری الف گرا کر "اں" اور "ایں" بڑھا دیتے ہیں جیسے کتیا سے کتیاں اور کتیئیں، بندریا سے بندریاں اور بندریئیں، لٹیا سے لٹیاں اور لٹیئیں۔

۸۔ مونث اسما کا آخری حصہ دور کر کے "ایں" بڑھا دیتے ہیں جیسے جوں سے جوئیں، بھوں سے بھوئیں۔

۹۔ مونث اسما کے خاتمے "آئے" پر "ایں" بڑھا دیتے ہیں جیسے گائے سے گائیں، رائے سے رائیں۔

ب۔ چلن

۱۔ اردو میں مندرجہ ذیل اسما ہمیشہ بطور جمع بولے جاتے ہیں:
ارد، گیہوں، دام، اوسان، دستخط، لچھن، معنی۔

۲۔ مندرجہ ذیل اسما ہمیشہ بطور واحد بولے جاتے ہیں:

الف: تمام دھاتیں یا ان کے آمیزے اور مرکبات جیسے پیتل، لوہا، سونا، چاندی، پانی، نمک، بالو، ریت۔

ب: اشخاص اور مقامات کے خاص نام جیسے محمود، حمید، نصیر، عرفان، سرگودھا، کراچی، لاہور، تاج محل۔

ج۔ عربی کی مندرجہ ذیل جمعیں اردو میں بطور واحد بولی جاتی ہیں:
خیرات، اولاد، ارواح، اخبار، احوال، اراضی، اخلاق، کائنات، تحقیقات، معلومات، رعایا، مواد، خرافات، اصول۔

جنس

انگریزی، قدیم یونانی، روسی اور جرمن زبانوں میں تین جنسیں ملتی ہیں۔ مذکر (نر کے لئے) مونث (مادہ کے لئے) اور بے جان۔ فرانسیسی میں صرف دو جنسیں مذکر اور مونث ہوتی ہیں اور اس میں بے جان اشیا کی بھی تذکیر و تانیث ہوتی ہے[1]۔ بعض امریکی اور افریقی زبانوں میں جنس کی ایک خاص شکل ہوتی ہے مثلاً شمالی امریکا کی الگونکین میں جاندار اور بے جان کی دو جنسیں ہوتی ہیں لیکن ان میں مختلف اشیا کی حد بندی کرتے وقت کوئی احتیاط نہیں برتی جاتی۔ چنانچہ جاندار جنس میں جانوروں کے ساتھ ساتھ درخت، پتھر، سورج، چاند، تارے، گرج، برف، برخ، غلہ، روٹی، تمباکو، سلیج گاڑی، چاقو وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں۔ ارمنی میں بھی جاندار اور بے جان کی دو جنسیں ہیں۔ مشرقی افریقہ کی مسائی نسل میں ایک جنس بڑی اور قوی شے کے لئے اور دوسری جنس ہر چھوٹی اور کمزور شے کے لئے ہوتی ہے یعنی اس میں دو جنسیں ہیں۔ قوی اور کمزور۔ سواحلی میں جانداروں اور بڑی اور چھوٹی چیزوں کے لئے الگ الگ جنسیں ہیں۔

اردو میں دو جنسیں ملتی ہیں۔ مذکر اور مونث جن میں جانداروں کے ساتھ ساتھ بے جان بھی تقسیم ہیں یعنی ہر بے جان چیز بھی مذکر ہوگی یا مونث۔ دراصل اردو کی جنس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ اس میں نر اور بڑی شے کے لئے ایک جنس (مذکر) ہے اور مادہ اور چھوٹی شے کے لئے دوسری جنس (مونث) ہے چنانچہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ دیگچا بھی مذکر ہے اور گھوڑی کے ساتھ ساتھ دیگچی مونث ہے البتہ ضمیر استفہامی میں "کون" کا لفظ انسانوں کے لئے اور لفظ "کیا" باقی تمام جانداروں اور بے جان چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

اردو میں تذکیر و تانیث کا مدار بناوٹ پر بھی ہے اور چلن پر بھی۔ اس لئے ذیل میں دونوں کے قاعدے درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ دراشی۔ جنرل لنگوئسٹکس ص ۲۳۲ و ۲۳۳۔ ۲۱۲۔

جاتے ہیں جیسے حشرح، نشوونما، آغوش، سانس، طرز، املا، بلبل، فکر، طلا وغیرہ۔

۱۰۔ اہل لکھنؤ ہر اسم کی جمع چاہے وہ مونث ہو چاہے مذکر ہمیشہ مذکر ہی بولتے ہیں جیسے ان کے رسوم، چاند کے منازل۔ حالانکہ رسم اور منزل دونوں اردو میں مونث بولے جاتے ہیں۔

حالت:

دنیا کی مختلف زبانوں میں اسمی حالتوں کی تعداد مختلف پائی جاتی ہے چنانچہ لاطینی اور انگریزی میں قدیم سے چھ (فاعلی، مفعولی، ندائی، اضافی، طابقی، جروری) قدیم یونانی میں پانچ، سنسکرت میں آٹھ اور فنی (فن لینڈ کی زبان) میں پندرہ حالتیں ملتی ہیں گو یہ سب معنی کے اعتبار سے ہیں لیکن اردو میں اسم کی دو خاص حالتیں ملتی ہیں۔ ایک فاعلی دوسری غیر فاعلی۔ اسم کی فاعلی حالت کی پہچان یہ ہے کہ اس وقت فعل عدد اور جنس کے لحاظ سے اس کے مطابق ہوتا ہے جیسے لڑکے شور مچا رہے ہیں۔ لڑکیاں گانا گائیں گی۔ ان جملوں میں لڑکے اور لڑکیاں فاعل ہیں کیونکہ ان کے فعل "مچا رہے ہیں" اور "گائیں گی" عدد اور جنس میں بالترتیب "لڑکے" اور "لڑکیاں" سے مطابقت رکھتے ہیں۔

غیر فاعلی حالت کی سلبی پہچان یہ ہے کہ اس وقت فعل عدد اور جنس میں اسم سے مطابقت نہیں رکھتا جیسے استاد نے لڑکے کو سزا دی۔ چوہا بلی سے ڈرتا ہے۔ ان جملوں میں "لڑکے" اور "بلی" کے اسما غیر فاعلی حالت میں ہیں کیونکہ ان کے افعال "دی" اور "ڈرتا ہے" عدد اور جنس میں ان سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ان کے برعکس "سزا" اور "چوہا" کے اسما فاعلی حالت میں ہیں جن سے افعال مطابقت رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ اردو زبان کا مثبت اصول یہ ہے کہ جب کسی اسم کے بعد کوئی عامل آجاتا ہے تو اس اسم کی حالت غیر فاعلی ہو جاتی ہے۔ مندرجہ بالا جملوں میں استاد کے بعد عامل "نے"، "لڑکے" کے بعد عامل "کو" اور "بلی" کے بعد عامل "سے" آیا ہے اس لئے بھی یہ تمام اسما غیر فاعلی حالت میں ہیں۔

گرامر نویسوں نے غیر فاعلی حالت کی بہت سی قسمیں عوامل کے معانی کے اعتبار سے کی ہیں۔ عوامل کے کچھ معانی باب "معنویات" میں بیان کئے جا چکے ہیں۔ پامر اپنی کتاب میں فلسور کی بتائی ہوئی چودہ حالتیں نقل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "فلسور دوسرے افعال کے لئے مزید حالتوں کی بھی ضرورت بتاتا ہے۔"[۲] چنانچہ ان میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ان سے کوئی فائدہ نہیں ہے البتہ

۱۔ واس، جنرل لنگوئسٹکس ص ۲۳۳ و ۲۴۰۔ ۲۔ پامر، ص ۵۵۔

ایک ندائی حالت ضرور قابل ذکر ہے کیونکہ اس کا کوئی عامل نہیں ہوتا لیکن اس حالت میں اسم کی صورت قدرے بدل جاتی ہے یعنی اسم واحد مذکر کا لاحقہ "آ" بدل کر "اے" ہو جاتا ہے۔ جمع مذکر کا لاحقہ "اے" ساقط ہو جاتا ہے اور تمام اسما کی جمع میں "او" کا لاحقہ لگ جاتا ہے۔ مثالیں یہ ہیں۔

(واحد مذکر)	اے لڑکے!	(جمع مذکر)	اے لڑکو!
	اے مرد		اے مردو!
(واحد مونث)	اے لڑکی!	(جمع مونث)	اے لڑکیو!
	اے عورت!		اے عورتو!

اردو کی طرح جاپانی زبان میں بھی اسمی حالتیں عاملوں سے طے پاتی ہیں جو اسم کے بعد آتے ہیں۔ انگریزی میں عامل اسم اور ضمیر سے پہلے آتے ہیں اور بعض ماہرین لسانیات کے قول کے مطابق صرف ضمیر کی حالتیں متعین کرتے ہیں۔ جرمن اور لاطینی میں بھی یہ اسم سے پہلے آتے اور ان کی حالتیں طے کرتے ہیں لیکن ترکی زبان میں حالتیں عاملوں سے نہیں لاحقوں سے بنتی ہیں۔[۱]

صفت:

صفت وہ لفظ ہے جو اسم کی خصوصیات بتاتا ہے جیسے ہرا پیڑ، پکا پھل۔ ان مرکبات میں پیڑ کا رنگ بتانے والا لفظ "ہرا" اور پھل کی حالت بتانے والا لفظ "پکا" صفت ہے اور پیڑ اور پھل کے الفاظ موصوف ہیں لیکن تمام زبانوں میں یہ دونوں (صفت اور اسم موصوف) ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں یعنی صفت اسم بن جاتی ہے اور اسم صفت۔ قواعدیات (گرامر) کے لحاظ سے ان میں کوئی واضح اور امتیازی حد فاصل نہیں ہے۔

اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ صفت نہ صرف اسم کے ساتھ استعمال ہوتی ہے جیسے چنچل بلی بلکہ جملے میں مسند کے طور پر بھی بولی جاتی ہے جیسے بلی چنچل ہوتی ہے۔ یہاں صفت "چنچل" نے اسم کی جگہ لے لی ہے۔ دوسری مثالیں دیکھئے۔ ڈرپوک گیدڑ اور گیدڑ ڈرپوک ہوتا ہے۔ چالاک لومڑی اور لومڑی چالاک ہوتی ہے۔ یہی کیفیت انگریزی، فارسی، فرانسیسی، جرمن، ہسپانوی، اطالوی اور ہنگرین زبانوں میں بھی ملتی ہے۔[۲]

دوسری دلیل یہ ہے کہ اسم بھی دوسرے اسم کی صفت بن جاتا ہے جیسے بحرہ کا ورش میں

۱۔ ولیم ڈیونٹ، اسکیس آف لنگوئج ص ۴۹ اور واس، جنرل لنگوئسٹکس ص ۱۲۹۔
۲۔ جنرل لنگوئسٹکس ص ۱۳۱ و ۱۳۸۔

بخرہ کا دوش کی صفت ہے۔ رنگ محل میں رنگ، محل کی صفت ہے۔ بانسہ بل میں بانسہ، بل کی صفت ہے۔ گھروالا میں گھر والا کی صفت ہے۔ ہتھ کٹا میں ہتھ (ہاتھ) کٹنا (کالا بجز۔ قن) کی صفت ہے۔

اردو میں بعض الفاظ بیک وقت اسم بھی ہیں اور صفت بھی جیسے لال اسم کی حیثیت سے ایک پرند اور ایک قیمتی پتھر کو کہتے ہیں اور صفت کی حیثیت سے اس کا مطلب سرخ رنگ ہے جیسے لال کرتی۔ کالا سیاہ کے معنوں میں صفت ہے یعنی سیاہ رنگ کا جیسے کالا آدمی۔ اور کالا بطور اسم کالے سانپ کو بھی کہتے ہیں۔ گول مدور کے معنوں میں صفت ہے لیکن فٹبال کے کھیل اور بڑے مٹکے کے معنوں میں اسم ہے۔ کھٹا ترش کے معنوں میں صفت اور پھل کے معنوں میں اسم ہے۔

عام طور پر صفت کی کتنی ہی قسمیں بیان کی گئی ہیں لیکن مشرق اور مغرب دونوں مقام پر معنی کے لحاظ سے قسمیں کی گئی ہیں جو غیر ضروری ہیں البتہ تصریف کے لحاظ سے اس کی دو ہی قسمیں ہیں۔ میلی اور بے میل۔

۱۔ بے میل: یہ وہ صفت ہے جو اپنے موصوف سے آزاد ہوتی ہے اور واحد، جمع، مذکر اور مونث سب کے ساتھ اپنی اصلی حالت میں یعنی غیر متغیر رہتی ہے جیسے لال مرغا، لال مرغے، لال مرغی، لال مرغیاں۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی، دو لڑکے، دو لڑکیاں۔ پہاڑی بکرا، پہاڑی بکری، پہاڑی بکرے، پہاڑی بکریاں۔ یہ صفت اسم کی طرح ضعیف ہوتی ہے۔

۲۔ میلی: یہ صفت اسم کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے البتہ واحد مونث اور جمع مونث میں یکساں رہتی ہے جیسے اچھا لڑکا، اچھے لڑکے، اچھی لڑکی، اچھی لڑکیاں۔ یہ صفت قوی ہوتی ہے۔

ضمیر:

اسم کی جگہ بولے جانے والے لفظ کو ضمیر کہتے ہیں جیسے میں، جو، کون وغیرہ۔ اردو کی ضمیروں میں عدد اور حالت کا تصور پایا جاتا ہے لیکن جنس نہیں ہوتی۔ اس کی چند قسمیں یہ ہیں۔

شخصی: دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تین صیغے ہوتے ہیں۔ بولنے والے کے لئے متکلم، جس سے بات کی جائے اس کے لئے صیغہ مخاطب یا حاضر اور جس کے بارے میں گفتگو کی جائے اس کے لئے صیغہ غائب استعمال ہوتا ہے لیکن ریڈ انڈین شمالی امریکا کی الگونکین زبانوں میں ایک چوتھا صیغہ اور بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اوجیبوا زبان کے اس جملے میں کہ "وہ اس شخص کو دیکھتا ہے" "وہ ضمیر کا تیسرا صیغہ غائب اور "اس شخص" چوتھا صیغہ ہے اور اس کے لئے الفاظ بھی معین ہوتے ہیں[1]۔

[1] جرنل لنگوئسٹکس ص ۲۰۰۔

انگریزی، عربی اور سنسکرت میں یہ تینوں صیغے اور ان کی ضمیریں موجود ہیں اور ان میں عدد اور جنس کی دونوں خصوصیات بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ عربی اور سنسکرت میں چودہ چودہ صیغے ہو جاتے ہیں لیکن انگریزی میں جنس صرف واحد غائب کے صیغے میں پائی جاتی ہے۔ فارسی میں بھی صیغے تو تین ہی ہوتے ہیں اور ان میں عدد بھی ملتا ہے لیکن جنس کا تصور نہیں ہے۔

ان زبانوں کے برعکس اردو میں صرف دو صیغے ہوتے ہیں۔ ایک متکلم (بولنے والا) اور دوسرا مخاطب (سننے والا) اور زبان کے یہی فطری، حقیقی اور اصلی صیغے ہیں اور ان کے قریبی تعلق کی اہمیت کا جتنا اندازہ ندائی حالت اور فعل امر سے ہوتا ہے اتنا اور کسی بات سے نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے یہاں ان کے لئے چار ہی الفاظ مقرر ہیں۔ (متکلم) میں اور ہم۔ (مخاطب) تو اور تم۔ ان کا نقشہ یہ ہے:

قسم / صیغہ	متکلم		مخاطب	
عدد	واحد	جمع	واحد	جمع
فاعلی	میں	ہم	تو	تم
غیر فاعلی	مجھ، مجھے	ہم، ہمیں	تجھ، تجھے	تم، تمھیں، آپ (تعظیمی)

اشاری: یہ ضمیر کسی شے، شخص یا خیال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ قریب اور بعید۔ اس کا نقشہ یہ ہے:

قسم / اشارہ	قریب یا حاضر		بعید یا غائب	
عدد	واحد	جمع	واحد	جمع
فاعلی	یہ	یہ	وہ	وہ
غیر فاعلی	اِس، اِسے	اِن، اِنھوں (نے کے ساتھ)	اُس، اُسے	اُن، اُنھوں (نے کے ساتھ)

موصولہ: یہ ضمیر دوسری ضمیر سے تعلق ظاہر کرتی ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ موصولہ اور صلہ۔ اس کا نقشہ یہ ہے:

قسم / تعلق	موصول		صلہ	
عدد	واحد	جمع	واحد	جمع
فاعلی	جو	جو	سو	سو
غیر فاعلی	جس	جن، جنھوں (نے کے ساتھ)	اُس	اُن، اُنھوں (نے کے ساتھ)

استفہامی: یہ ضمیر سوال کرنے میں بولی جاتی ہے۔ اس کا نقشہ یہ ہے:

عدد	واحد	جمع
فاعلی غیر فاعلی	کون۔ کیا کس۔ کسے	کون کن۔ کنھوں (نے کے ساتھ)

تنکیری: یہ ضمیر غیر معین ذات کے لیے بولی جاتی ہے۔ اس کا نقشہ یہ ہے:

عدد	واحد	جمع
فاعلی غیر فاعلی	ایک۔ کوئی کسی	کچھ کنھیں

کلی: اس کے لیے اردو میں ایک ہی لفظ "سب" بولا جاتا ہے جس سے پورا مجمع یا مجموعہ مراد ہوتا ہے۔ جیسے سب آگئے۔ سب نے سب کو دیکھ لیا۔ سب دھر ڈھک دیا۔

خودی: اس کے لیے لفظ "آپ" (خود) استعمال ہوتا ہے اور ضمیر پر اصرار مراد ہوتا ہے جیسے میں آپ آجاؤں گا۔ ہم آپ چلے جائیں گے۔ تو آپ سمجھ لے گا۔ تم آپ تلاش کرلو۔

عامل:

جو الفاظ اسما کو باہمی ربط دیتے ہیں عامل کہلاتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

سے۔ کا۔ کی۔ کے۔ کو۔ نے۔ کر (کے)۔ پر (پہ۔ پے)۔ تک (تلک)۔ میں۔

انگریزی اور فارسی میں یہ الفاظ اسم اور ضمیر سے پہلے لیکن اردو میں اسم اور ضمیر کے بعد آتے ہیں اور ان پر دو طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

۱۔ ان کے باعث اسم اور صفت کا امالہ ہو جاتا ہے یعنی یہ جس قوی اسم اور صفت کے بعد آتے ہیں اس کے آخری الف "ا" کو "ے" سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے:
لڑکا آیا اور لڑکے نے کھانا کھایا۔ گھوڑا دوڑتا ہے اور گھوڑے کو پانی پلاؤ۔ مجھے پکا گانا پسند ہے لیکن سب لوگ پکے گانے کو پسند نہیں کرتے۔

۲۔ یہ جس اسم اور ضمیر کے بعد آتے ہیں اس کو غیر فاعلی حالت میں لے آتے ہیں۔ جیسے:

الف۔ احمد چڑیا کو اڑاتا ہے

ب۔ احمد نے چڑیا اڑائی۔

پہلے جملے میں احمد فاعل ہے اور چڑیا غیر فاعلی حالت میں ہے لیکن دوسرے جملے میں چڑیا فاعل ہے اور احمد غیر فاعلی حالت میں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے جملے میں فعل عدد اور جنس میں احمد سے اور دوسرے جملے میں چڑیا سے مطابقت رکھتا ہے۔

عامل ہمیشہ اسم اور ضمیر کے بعد آتا ہے اور درمیان میں کسی اور لفظ کے آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جو لوگ دونوں میں جدائی ڈالتے ہیں وہ اردو زبان کے مزاج سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

کچھ لوگ بعض اوقات گفتگو میں عامل حذف بھی کر دیتے ہیں جیسے احمد آج (کی) شام (کو) میرے گھر (پر) آرہا ہے۔ ایسے جملے ریڈیو اور ٹیلی وژن کی اکثر نشریات میں سنے جاتے ہیں۔

کبھی کبھی دو دو عامل ملا کر بھی بولے جاتے ہیں جیسے: وہ ہم میں سے ہے۔ جماعت میں کے آدمی۔ اس نے اپنے چیلوں تک کو تعلیم نہیں دی۔ پھل توڑنے والا پیڑ پر سے گر پڑا۔

عطفیہ:

دو الفاظ یا دو جملوں کو ملانے والا لفظ عطفیہ کہلاتا ہے۔ عطفیے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تنہا آتے ہیں اور دوسرے وہ جو جوڑوں میں بولے جاتے ہیں یعنی مفرد اور مرکب۔

مفرد۔ یہ تنہا آتے ہیں اور دوسرے عطفیے کے محتاج نہیں ہوتے جیسے:

اور۔ پر۔ کہ۔ اس لیے۔ اس لیے کہ۔ کیوں کہ۔ یوں کہ۔ جبکہ۔

مثالیں یہ ہیں:

بھونرا اڑتا ہوا آیا اور پھول پر بیٹھ گیا۔
محاورہ کہتے ہیں کہ ایک اسم اور ایک فعل کے ملنے سے بنتا ہے۔
میں کچھ دیر اور رک جاتا پر مجھے گھر پر کام ہے۔
اس نے کہا کہ میں کل آؤں گا۔
تم آتے ہو کہ میں آؤں۔
مجھے گھر پر کام ہے اس لیے اب میں چلتا ہوں۔

[illegible]

بچا اُن کے پاس پھر آ گیا جبکہ اس نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔
آپ کے خط کا انتظار رہے گا اس لئے کہ درخواست دینے کی میعاد بہت کم ہے۔
میں کل جلدی چلا گیا تھا کیونکہ مجھے گھر پر کام تھا۔
یہ کیا کم ہے جو میں آج آ گیا۔
تم نے کہا تھا جو میں آ جاتا؟
مرکب۔ یہ تنہا نہیں آتے بلکہ جوڑوں میں بولے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر صلہ و موصول سے تعلق رکھتے ہیں جیسے:

جو ..... سو (وہ)۔	جو ہو سو ہو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ جو چاہا وہ کیا۔
جو ..... تو	جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا۔
جب ..... تب	جب تم کہو گے تب میں آ جاؤں گا۔
جب ..... تو	جب تمھیں ہماری ناقدری کرو گے تو قدر کون کرے گا۔
اس لئے ..... کہ	میں آپ کو اس لئے بلاتا ہوں کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔
یوں ..... کہ	میں یوں چلا گیا کہ مجھے کچھ کام تھا۔

کلماتِ تاکید:

اردو میں کچھ الفاظ زور دینے کے لئے بھی بولے جاتے ہیں جیسے:
بھی۔ (اشتمالی)۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا۔
ہی۔ (حصری)۔ تینوں جملوں کا مطلب ایک ہی ہے۔
تو۔ (خصوصی)۔ میں شیخ صاحب کو سیدھا سمجھتا تھا مگر وہ تو گرو نکلے۔

متعلق فعل:

کہتے تو یہ ہیں کہ متعلق فعل ایک ایسا لفظ ہے جو فعل کی کوئی نہ کوئی خصوصیت جیسے وقت، جگہ، طریقہ وغیرہ بتاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی حیثیت ردی کی ٹوکری کی سی ہوتی ہے کہ جو لفظ کسی اور مد میں نہ کھپتا ہو وہ اس کے خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:
اب جب تب کب، ابھی جبھی تبھی کبھی، یہاں وہاں جہاں کہاں، یہیں وہیں کہیں،

اِدھر اُدھر جدھر کدھر، یوں توں جوں کیوں، جوں ہی یوں ہی، ایسے جیسے تیسے ویسے کیسے، پہلے آگے پیچھے سامنے، اوپر نیچے بھیتر باہر دائیں بائیں، ہولے دھیرے، اچھے برے، سو تو وغیرہ۔
ان کے علاوہ بہت سے مرکبات بھی ہوتے ہیں۔

فعل:

جس لفظ سے کام کا کرنا، ہونا یا بھگتنا پایا جائے اسے فعل کہتے ہیں جیسے اصغر آیا۔ اس جملے میں آیا فعل اور اصغر اس کا فاعل (آنے والا) ہے۔ فعل کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جن میں کی سب سے پہلی شکل امر ہے اور امر مادے سے بنتا ہے جس کا ذکر باب ''لفظیات'' میں کیا جا چکا ہے لہٰذا سب سے پہلے مادے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مادہ

کلامیات (گرامر) کے لحاظ سے مادے کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ اسمی اور فعلی۔
۱۔ اسمی مادہ۔ اس سے مختلف اسمی روپ تیار ہوتے ہیں۔ اس کی تصریف ہوتی ہے اور اس پر عدد، جنس اور حالت کی کچھ علامات کا اضافہ ہوتا ہے جیسے اونٹ، لات، جڑ، لفظ سے اونٹوں، لاتوں، جڑوں، لفظوں، لاتیں، جڑیں وغیرہ۔
۲۔ فعلی مادہ۔ اس سے مختلف فعلی روپ بنتے ہیں۔ اس کی گردان ہوتی ہے اور طور، زمانے اور صیغے وغیرہ کے لحاظ سے اس پر کچھ علامات کا اضافہ ہوتا ہے جیسے چل سے چلا، چلے، چلنا۔ پڑھ سے پڑھا، پڑھے، پڑھنا وغیرہ۔
فعلی مادہ بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی۔
۱۔ ابتدائی: یہ وہ مادہ ہے جو واضعِ زبان نے پہلی بار بنیادی آوازوں سے بنایا تھا جیسے چل، پھر، کھا، پی، سو وغیرہ۔
۲۔ ثانوی: یہ وہ مادہ ہے جو ابتدائی مادے پر کسی امر کے اضافے سے بنتا ہے۔ یہ بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔
الف۔ ابتدا میں اضافے سے بننے والا۔ یہ وہ مادہ ہے جو ابتدائی مادے کا ابتدائی

امر دہرا کر بنایا گیا ہے۔ اسے تکی کہتے ہیں جیسے: دھول۔ ٹھول، چھوڑ۔ کھکھل۔ موڑ۔

ب۔ آخر میں اضافے سے بننے والا۔ یہ وہ مادہ ہے جس کے آخر میں مختلف اسم بڑھا دیے جاتے ہیں لیکن معنی میں فرق نہیں آتا جیسے: ڈھل سے ڈھلک، موڑ سے مڑک، بیل سے بلک، گھونٹ سے گھٹک، آنٹ سے اٹک، داب سے دبک، بیچ سے بچکل اور بچک، بین سے بچ، گھونس (گھس) سے گھسڑ، بس سے بسڑ۔

امر

اردو فعل کے تمام روپ امر سے بنائے جاتے ہیں۔ اس میں واحد مخاطب کا صیغہ مضمر ہوتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ مفرد مادہ (ابتدائی یا ثانوی) جیسے: کر۔ دوڑ۔ لا۔ بیٹھ۔ بھڑک۔ دھڑک۔ بچل۔ گھسڑ وغیرہ۔ یہ مادہ اسم بھی ہوتا ہے۔

۲۔ ابتدائی یا ثانوی مادے پر مندرجہ ذیل لاحقوں کے اضافے سے بننے والا۔
الف۔ نا جیسے دوڑنا۔ پکڑنا۔ لینا۔
ب۔ یو جیسے دوڑیو۔ پکڑیو۔ چلیو۔
ج۔ یجیو جیسے کیجیو۔ دیجیو۔ لیجیو۔

۳۔ اسمی یا دوہرے اور مرکب مادے پر مندرجہ ذیل لاحقوں کے اضافے سے بننے والا:
الف۔ آ جیسے بات سے بتا (نا)۔ ٹھٹھر سے ٹھٹھرا (نا)۔ بھٹھر سے بھٹھرا (نا)۔ گدر سے گدرا (نا)۔ چور سے چرا (نا)۔ لالچ سے للچا (نا)۔ گرم سے گرما (نا)۔ شرم سے شرما (نا)۔ قلم سے قلما (نا)۔ فلم سے فلما (نا)۔ نرم سے نرما (نا)۔ تحت سے تختا (نا)۔ گھبر سے گھبرا (نا)۔ دھڑ دھڑ سے دھڑ دھڑا (نا)۔ پل پل سے پلپلا (نا)۔ بھڑ بھڑ سے بھڑ بھڑا (نا)۔ سن سن سے سن سنا (نا)۔ سَنّا (نا)۔ ژر ژر سے ژرژرا (نا)۔ ژرّا (نا)۔ چرچر سے چرچرا (نا)۔ چرّا (نا)۔ سرسر سے سرسرا (نا)۔ سرّا (نا)۔ غرغر (غرغر) سے غرغرا (نا)۔ غرّا (نا)۔ ادر سے ادرا (نا)۔ اترا (نا)۔ بل بل سے بلبلا (نا)۔ بلا (نا)۔

جھنگ سے جھنگا (نا)۔ گڑگڑ سے گڑگڑا (نا)۔ کھلبل سے کھلبلا (نا)۔ ٹھس سے ٹھسا (نا)۔ بڑبڑ سے بڑبڑا (نا)۔ اُل جُل سے اُلجھا (نا)۔ بیچ کچ سے بچکچا (نا) وغیرہ۔

ب۔ آل جیسے بیٹھ سے بٹھال (نا)۔ لیٹ سے لٹال (نا)۔ جھوٹ سے جھٹال (نا)۔

ج۔ ایا جیسے بات سے بتیا (نا)۔ لات سے لتیا (نا)۔ لٹھ سے لٹھیا (نا)۔ موٹھ سے مٹھیا (نا)۔ کس سے کسیا (نا)۔ ہاتھ سے ہتھیا (نا)۔ ٹانگ سے ٹنگیا (نا)۔ چپت سے چپتیا (نا)۔ گھن سے گھنیا (نا)۔ پت سے پتیا (نا) وغیرہ۔

د۔ لا جیسے بات سے بتلا (نا)۔ اٹھ سے اٹھلا (نا)۔ جھوٹ سے جھٹلا (نا)۔ سیکھ سے سکھلا (نا)۔ دیکھ سے دکھلا (نا)۔ سکھ سے سکھلا (نا)۔ بیٹھ سے بٹھلا (نا) وغیرہ۔

ہ۔ بعض بعض الفاظ کے دو دو تین تین روپ بھی ملتے ہیں جیسے بتا (نا)، بتلا (نا)، بتیا (نا)۔ سکھا (نا)، سکھلا (نا)۔ دکھا (نا)، دکھلا (نا)۔ سکھا (نا)، سکھلا (نا)۔ جتا (نا)، جتلا (نا)۔ بٹھا (نا)، بٹھلا (نا)، بٹھال (نا)۔ لٹا (نا)، لٹال (نا)، لٹلا (نا)۔ جھٹال (نا)، جھٹلا (نا)۔ گھما (نا)، گھملا (نا) وغیرہ۔

واسطہ

اردو میں کام کرنے کے تین واسطے ہوتے ہیں جس کے باعث ایک ایک مادے یا امر کے تین تین روپ بن جاتے ہیں جیسے دیکھ دکھا دکھوا۔ چل چلا چلوا وغیرہ۔ ایسے واسطے عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت وغیرہ میں نہیں ملتے۔

۱۔ پہلا واسطہ وہ کہلاتا ہے جب کام خود کیا جاتا ہے۔ یہ سیدھا سادہ سا امر ہوتا ہے جیسے: چل (نا)۔ دیکھ (نا)۔ سیکھ (نا)۔ رو (نا)۔ پی (نا)۔ دے (نا) وغیرہ۔

۲۔ دوسرا واسطہ وہ کہلاتا ہے جب دوسرے سے کام کرایا جاتا ہے۔ یہ مادے کے آخری اسم پر "آ" اور آخری سر پر "لا" کے اضافے سے بنتا ہے جیسے: چل سے چلا (چل + آ)۔ دیکھ سے دکھا (دیکھ + آ)۔ رو سے رلا (رو + لا)۔ پی سے پلا (پے + لا)۔ دھو سے دھلا (دھو + لا)۔ کھا سے کھلا (کھے + لا)۔ لیکن بعض بعض آخری سروں پر "آ" "لا" یا دونوں لاحقے لگا کر بنایا جاتا ہے جیسے دکھا (دیکھ + آ) اور دکھلا (دیکھ + لا)۔ سکھا (سیکھ + آ) اور سکھلا (سیکھ + لا)۔ بٹھا (بیٹھ + آ) اور بٹھلا (بیٹھ + لا)۔ جھٹلا (جھوٹ + لا) وغیرہ۔

۳۔ تیسرا واسطہ وہ کہلاتا ہے جب دوسرے شخص کی معرفت کسی اور یعنی تیسرے شخص سے کام کروایا جاتا ہے۔ یہ مادے کے آخری اسر پر "وا" اور آخری سر پر "لوا" کے اضافے سے بنتا ہے جیسے: چل سے چلوا (نا)۔ دیکھ سے دکھوا (نا) اور دکھلوا (نا)۔ سیکھ سے سکھوا (نا) اور سکھلوا (نا)۔ بیٹھ سے اٹھوا (نا) اور بٹھلوا (نا)۔ رو سے رلوا (نا)۔ دھو سے دھلوا (نا)۔ پی سے پلوا (نا)۔ دے سے دلوا (نا) وغیرہ۔

نوٹ: بعض افعال میں واسطے نہیں ہوتے جیسے آ (نا)۔ جا (نا)۔ رو (نا)۔ سہ (نا)۔ پا (نا) وغیرہ۔

حالیہ

یہ فعلی روپ بھی امر سے بنتا ہے اور اسم ہوتا ہے کیونکہ اس میں اسم کی خصوصیات (عدد، جنس اور حالت) پائی جاتی ہیں۔ اس کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ ناتمام۔ یہ امر پر لاحقہ "تا" لگنے سے بنتا ہے جیسے کھا سے کھاتا، لا سے لاتا، دیکھ سے دیکھتا۔ اس سے فعل معتاد کا تاثر ملتا ہے۔ جب یہ فعل شرطی میں صیغوں کی علامات کے بغیر آتا ہے اس وقت اسم کی طرح اس کے بھی چار روپ ہوتے ہیں۔ کھاتا کھاتی کھاتے کھاتیں، چلتا چلتی چلتے چلتیں لیکن جب یہ صیغوں کی علامات کے ساتھ آتا ہے تو اس کے صرف تین ہی روپ رہ جاتے ہیں۔ کھاتا کھاتی کھاتے اور واحد مونث کے روپ سے ہی جمع مونث کا بھی کام لے لیا جاتا ہے جیسے تو آتی ہے، تم آتی ہو۔ امر کے تینوں واسطوں سے اس کی بھی تین تین شکلیں بن جاتی ہیں جیسے کھاتا کھلاتا کھلواتا، کھاتی کھلاتی کھلواتی، کھاتے کھلاتے کھلواتے، کھاتیں کھلاتیں کھلواتیں۔

اسے بطور اسم بولتے وقت کبھی کبھی اس پر "ہوا" کا لاحقہ بھی بڑھا دیتے ہیں جیسے چلتا ہوا، بولتا ہوا۔

۲۔ جاری۔ یہ حالیہ امر پر لاحقہ رہا (اصل را) کے اضافے سے بنتا ہے۔ جیسے چل سے چل رہا (چل را)۔ دیکھ سے دیکھ رہا (دیکھ را)۔ اس میں تسلسل زمانی کا تصور ملتا ہے۔ چونکہ یہ صرف صیغوں کی علامات کے ساتھ ہی بولا جاتا ہے اور ان کے بغیر نہیں آ سکتا اس لئے اس کے صرف تین ہی روپ ملتے ہیں۔ چل رہا، چل رہی، چل رہے۔ کر رہا، کر رہی، کر رہے۔ اس کے واحد مونث کا روپ ہی جمع مونث کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ امر کے تینوں واسطے اس میں بھی ملتے ہیں۔ چل رہا، چلا رہا، چلوا رہا۔ رو رہا، رلا رہا، رلوا رہا۔

۳۔ تمام۔ امر کے آخر اسر پر "ا" اور آخری سر پر "یا" کے اضافے سے بنتا ہے جیسے چل سے چلا، دیکھ سے دیکھا، کھو سے کھویا، کھا سے کھایا، جی سے جیا، پی سے پیا۔ صیغوں کی علامات کے بغیر آنے پر اس کے بھی چار روپ چلا، چلی، چلے، چلیں اور ان کے ساتھ آنے پر صرف تین روپ چلا، چلی، چلے بولے جاتے ہیں اور جمع مونث کے لئے واحد مونث ہی کا روپ استعمال ہو جاتا ہے۔ فعلی واسطوں سے اس کے روپ یہ ہیں۔ دیکھا دکھایا دکھوایا۔ رویا رلایا رلوایا۔ پیا پلایا پلوایا۔

حالیہ ناتمام کی طرح بطور اسم بولتے وقت کبھی کبھی اس پر بھی "ہوا" کا اضافہ کر دیتے ہیں جیسے چلا ہوا، چلایا ہوا، چلوایا ہوا۔

۴۔ آغاز۔ امر پر "نا" کے اضافے سے بنتا ہے۔ جیسے جا سے جانا، پڑھ سے پڑھنا، سو سے سونا، جی سے جینا۔ چونکہ یہ حالیہ صیغوں کی علامات کے بغیر نہیں بولا جاتا اس لئے حالیہ جاری کی طرح اس کے بھی تین ہی روپ ہوتے ہیں۔ جانا، جانی، جانے۔ سیکھنا، سیکھنی، سیکھنے۔ فعلی واسطوں سے اس کے بھی تین روپ بن جاتے ہیں۔ دیکھنا دکھانا دکھوانا۔ سیکھنا سکھانا سکھوانا۔ دینا دلانا دلوانا۔ جینا جلانا جلوانا۔

اسم فعل

اسے اردو قواعدیات کی کتابوں میں غلطی سے مصدر لکھا گیا ہے۔ یہ فعل کا نام ہوتا ہے اور امر پر "نا" کے اضافے سے بنتا ہے جیسے آ سے آنا، چل سے چلنا، سو سے سونا، پی سے پینا۔

اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ سادہ اور مرکب۔

۱۔ سادہ۔ یہ امر سے بنتا ہے۔ جیسے کھا سے کھانا، بتا سے بتانا، لے سے لینا، کھٹ کھٹا سے کھٹ کھٹانا، جگمگا سے جگمگانا، کھنیا سے کھنیانا۔ لٹھیا سے لٹھیانا۔

۲۔ مرکب۔ یہ دو یا تین امروں سے بنتا ہے جیسے کھا ڈھنا، چل دینا، اٹھ جانا، کھا پی جانا وغیرہ۔ اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

الف۔ عطفی۔ اس کے دونوں امر حیثیت میں مساوی ہوتے ہیں اور ان کے افعال یکے بعد دیگرے سرزد ہوتے ہیں جیسے آ ڈھنا (آنا پھر ڈھنا)۔ جا پکڑنا (جانا پھر پکڑنا)۔ سو اٹھنا (سونا اور پھر جاگنا یعنی سونے کے بعد جاگنا)۔ مانگ کھانا (مانگنا اور پھر کھانا)۔ دیکھ جانا (دیکھنا اور پھر چلے جانا) وغیرہ۔

ب۔ توصیفی۔ اس کا پہلا امر بنیادی ہوتا ہے اور دوسرا امر اس کی تعریف یا تحدید کرتا ہے۔ یوں ایک طرح سے یہ اسم فعل مرکب توصیفی ہوتا ہے مثلاً دیکھ اٹھنا (اچانک دیکھنا)۔ دیکھ پانا (دیکھنے کا موقع پانا)۔ دیکھ سکنا (دیکھنے کی قوت رکھنا)۔ دیکھ لینا (اپنی غرض کے لئے دیکھنا)۔ دیکھ دینا (دوسرے کے لئے دیکھنا) وغیرہ۔

ج۔ عطف توصیفی۔ یہ قسم مندرجہ بالا دونوں قسموں کا مجموعہ ہے جو تین امروں سے بنتی ہے جیسے کھاپی ڈالنا۔ بیں پھر لینا۔ ہو ہرڈھک دینا۔ مرکھپ جانا۔ دیکھ بھال لینا۔ گھر پڑ جانا وغیرہ۔ ان میں سے پہلے دو امر عطفی اسم فعل ہوتے ہیں جن کے درمیان لفظ "اور" پوشیدہ رہتا ہے اور تیسرا امر جس پر اسم فعل کی علامت "نا" لگتی ہے ان کی صفت یا خصوصیت بیان کرتا ہے۔

فعل کی قسمیں

مغرب کی بہت سی زبانوں میں فعل کی دو قسمیں لازم اور متعدی ملتی ہیں۔ عربی میں بھی یہ دونوں قسمیں ملتی ہیں۔ یہ قسمیں معنی کے اعتبار سے کی گئی ہیں۔ اردو کے گرامر نویسوں نے جہاں پوری کی پوری گرامر عربی سے مستعار لی ہے وہاں فعل کی یہ دونوں قسمیں بھی لے لیں اور نتیجے میں الجھنوں کے پہاڑ کھڑے ہو گئے۔

اردو کے گرامر نویسوں نے معنی کے اعتبار سے فعل کی تین قسمیں لازم، متعدی اور متعدی المتعدی یا متعدی بالواسطہ بتائی ہیں۔ ان کے مطابق فعل لازم کے ساتھ صرف فاعل آتا ہے جیسے احمد جاتا ہے۔ اس جملے میں جاتا ہے فعل اور احمد فاعل ہے۔ متعدی کے ساتھ فاعل اور مفعول دونوں آتے ہیں۔ جیسے احمد نے روٹی کھائی۔ اس جملے میں احمد فاعل اور روٹی مفعول ہے کیونکہ روٹی پر فعل "کھانے" کا اثر پڑ رہا ہے۔ متعدی المتعدی وہ فعل ہے جو متعدی سے بنایا جاتا ہے جیسے چلانا سے چلوانا۔

اس تقسیم کے رو سے آنا جانا وغیرہ تو خیر ایسے فعل ہیں جن کا متعدی ہی نہیں ہوتا لیکن دوسرے لازم افعال سے جو متعدی اور متعدی المتعدی بنیں گے ان کا نقشہ یہ ہو گا۔

لازم	متعدی	متعدی المتعدی
چلنا	چلانا	چلوانا
بھاگنا	بھگانا	بھگوانا
جاگنا	جگانا	جگوانا

ان کے علاوہ بہت سے ایسے فعل بھی ہوتے ہیں جو انھیں گرامر نویسوں کے نزدیک متعدی ہیں اور ان کا فعل لازم نہیں ہوتا جیسے کھانا، پڑھنا، لکھنا، پینا وغیرہ۔ اس کے باوجود ان کی بھی شکلیں (اردو کے واسطے) تین ہوتی ہیں۔ جیسے، کھانا کھلانا کھلوانا، پڑھنا پڑھانا پڑھوانا۔ لکھنا لکھانا لکھوانا۔ پینا پلانا پلوانا۔ ان واسطوں کے لحاظ سے ان کا نقشہ یہ بنتا ہے۔

لازم	متعدی	متعدی المتعدی	؟
؟	کھانا	کھلانا	کھلوانا
؟	پینا	پلانا	پلوانا
؟	پڑھنا	پڑھانا	پڑھوانا
؟	لکھنا	لکھانا	لکھوانا

ان افعال کا سرے سے لازم روپ ہی نہیں ہے اور پھر متعدی المتعدی کے بعد بننے والے تیسرے روپ کا بھی کوئی نام نہیں ہے۔ اس الجھن کی وجہ یہ ہے کہ گرامر نویسوں نے اردو کے واسطوں کو عربی افعال کی قسموں سے خلط ملط کر دیا ہے۔ اردو فعل میں لازم اور متعدی یا ناقص کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ اردو فعل کی تقسیم معنی کے لحاظ سے کی گئی ہے۔

اردو میں فعل کی تقسیم "نے" کے لحاظ سے کی گئی ہے۔

۱۔ وہ افعال جن کے ماضی تمام کے ساتھ "نے" بولا جاتا ہے جیسے دیکھنا، لینا، سننا، کہنا، سیکھنا، چھوڑنا، چکھنا، سینا، پینا، پھینکنا، چاہنا، کرنا، کھونا، گھیرنا، سمجھنا، پانا، دھونا، پڑھنا، لکھنا، رکھنا وغیرہ۔

۲۔ وہ افعال جن کے ماضی تمام کے ساتھ "نے" نہیں بولا جاتا جیسے آنا، جانا، بھاگنا، اڑنا، اٹھنا، بیٹھنا، بچنا، بیٹھنا، ٹھہرنا، اگنا، سونا، ہلنا، ملنا، ٹوٹنا، چھوٹنا، جینا، مرنا، لانا، گرنا، رکنا، پھسلنا، ہونا، پھولنا، رہنا، نکلنا، لگنا، بھونا، بھولنا، ہنسنا، جھکنا، برسنا وغیرہ۔

۳۔ وہ افعال جن کے ماضی تمام کے ساتھ کبھی "نے" بولا جاتا ہے اور کبھی نہیں بولا جاتا جیسے مسافر دن بھر چلا۔ دشمن نے ایک چال چلی۔ گھوڑا دوڑا۔ کھلاڑی نے دو سو گز کی دوڑ دوڑی۔ بچہ دن میں کھیلا اور رات کو سو گیا۔ بچے نے فٹ بال کھیلی۔ آخر میں ہمایوں ہارا اور شیر شاہ سوری جیتا۔ ایک حریف نے شرط جیتی اور دوسرے نے رقم ہاری۔ کیا بولا۔ میرے دوست نے مجھ سے انگریزی بولی۔ گھڑا الٹا اور سارا پانی بہہ گیا۔ رقم نکالنے کے لئے تالا

نے اپنی جیب الٹی۔ کیا دفتر کے چکر لگاتے لگاتے جوتے نہیں گھسے؟ منشی نے قلم کی نوک گھسی اور پھر لکھنے لگا۔ وہ رو دیا۔ اس نے دکھڑا رو دیا۔

عام طور پر اردو کی گرامر لکھنے والے کہتے ہیں کہ لفظ "نے" فاعل کی علامت ہے اور یہ فعل متعدی ماضی کے ساتھ آتا ہے لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں کیونکہ:

الف۔ پاک بھارت کی زبانوں ہی کا نہیں یورپ کی انگریزی اور دوسری زبانوں کا بھی ایک ہمہ گیر اصول یہ ہے کہ جملے کا فعل عدد اور جنس میں اپنے فاعل کا اتباع کرتا ہے یعنی فاعل واحد ہے تو فعل بھی واحد ہوگا اور اگر فاعل مونث ہے تو فعل بھی مونث ہوگا مثلاً لڑکا آیا۔ لڑکی آئی۔ لڑکے آئے۔ لڑکیاں آئیں۔ ان جملوں کے افعال (آیا، آئی، آئے، آئیں) بالترتیب اپنے اپنے فاعل (لڑکا، لڑکی، لڑکے، لڑکیاں) سے عدد اور جنس میں مطابقت رکھتے ہیں۔

اب نیچے لکھے ہوئے دوسرے جملوں پر غور کیجئے۔

احمد نے روٹی کھائی۔ عورت نے ایک سیب کھایا۔ لڑکوں نے چھ ناشپاتیاں کھائیں۔ لڑکیوں نے دس آم کھائے۔ ان جملوں کے افعال کھائی، کھایا، کھائیں اور کھائے عدد اور جنس میں بالترتیب روٹی، سیب، ناشپاتیاں اور آم سے مطابقت رکھتے ہیں اور اردو گرامر نویسوں کے عام خیال کے خلاف احمد، عورت، لڑکوں اور لڑکیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس سے یہ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ "نے" علامت فاعل نہیں ہے بلکہ غیر فاعلی حالت کی دلیل ہے جو گرامر کی رائج الوقت کتابوں میں حالت کل کہلاتی ہے۔ ان جملوں کے فاعل روٹی، سیب، ناشپاتیاں اور آم ہیں۔

ب۔ "نے" کا استعمال صرف ماضی متعدی سے مخصوص کر دینا بھی غلط ہے اس لئے کہ "نے" ان افعال کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے جنھیں اردو کے گرامر نویس لازم کہتے ہیں مثلاً احمد نے تھوکا۔ محمود نے چھینکا۔ بیمار نے کھانسا۔ بچے نے ہگا۔ چیل نے موتا۔ کوئل نے پادا۔ ان جملوں میں جو افعال آئے ہیں وہ گرامر نویسوں کے خیال سے افعال لازم ہیں۔ اس کے باوجود ان کے ساتھ "نے" کا استعمال ہوتا ہے۔ دوسری طرف بعض نام نہاد متعدی افعال کے ساتھ "نے" نہیں بولا جاتا جیسے وہ ایک کتاب لایا۔ سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری۔ آج مولانا مثنوی خوب پڑھے۔ ان جملوں میں لایا، سیکھے اور پڑھے افعال متعدی ہیں پھر بھی ان کے ساتھ "نے" نہیں بولا گیا۔

پھر لازم اور متعدی میں اردو افعال کی تقسیم ہی غیر منطقی اور غیر فطری ہے۔ مثال کے لئے

۱۔ کشاف ہندی گرامر ص ۹۲۔

ان چند جملوں پر غور کیجئے:

احمد نے چال چلی۔ محمود نے شطرنج کھیلی۔ زنگی نے خوب کتھک ناچا۔ کھلاڑی نے پے در پے تین دوڑیں دوڑیں۔ بیمار نے خون تھوکا۔ ان جملوں میں چلنا، کھیلنا، ناچنا، دوڑنا اور تھوکنا اردو کے گرامر نویسوں کے خیال میں افعال لازم ہیں۔ اب اگر ان کے نزدیک احمد، محمود، زنگی، کھلاڑی اور بیمار ان جملوں کے فاعل ہیں تو یہ افعال ان فاعلوں کی جگہ چال، شطرنج، کتھک، دوڑیں اور خون سے مطابقت کیوں رکھتے ہیں؟ ان آخرالذکر اسما کو نہ وہ مفعول کہہ سکتے ہیں نہ خبر کیونکہ فعل لازم کے ساتھ نہ مفعول آسکتا ہے نہ خبر۔ لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہی فاعل ہیں۔ اب ان جملوں پر نظر ڈالئے:

(۱)	(۲)
احمد نے روٹی کھائی۔	احمد سے روٹی کھائی گئی / نہیں کھائی گئی۱
عورت نے ایک سیب کھایا۔	عورت سے ایک سیب کھایا گیا / نہیں کھایا گیا۔
لڑکوں نے چھ ناشپاتیاں کھائیں۔	لڑکوں سے چھ ناشپاتیاں کھائی گئیں / نہیں کھائی گئیں۔
لڑکیوں نے دس آم کھائے۔	لڑکیوں سے دس آم کھائے گئے / نہیں کھائے گئے۔

اوپر کے دونوں گروہوں میں افعال وہی ہیں اور اردو کے گرامر نویسوں کے مطابق افعال متعدی ماضی ہیں پھر بھی فرق یہ ہے کہ پہلے گروہ کے جملوں میں "نے" آیا ہے اور دوسرے گروہ کے جملوں میں "سے" کا عامل بولا گیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ پہلے گروہ کے تمام افعال (کھائی، کھایا، کھائیں، کھائے) طور معروف میں اور دوسرے گروہ کے افعال (کھائی گئی، کھایا گیا، کھائی گئیں، کھائے گئے) طور مجہول میں بولے گئے ہیں۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

۱۔ "نے" نہ صرف ماضی متعدی کے ساتھ آتا ہے بلکہ ماضی لازم کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے اس لئے اسے صرف ماضی متعدی سے مختص کر دینا غلط ہے۔

۲۔ "نے" اور "سے" دونوں حالت کل کے عامل ہیں۔ ان میں سے "نے" فعل ماضی معروف کے ساتھ اور "سے" ماضی مجہول کے ساتھ آتا ہے۔

۳۔ "نے" صرف اسی ماضی معروف کے ساتھ آسکتا ہے جس کے مجہول طور کے ساتھ "سے" بھی آتا ہے۔

۱۔ بول چال میں ان جملوں کی بیشتر یہی اشکال شائع ہے۔

فعل کا طور

عربی، فارسی میں فعل کے صرف دو طور ملتے ہیں۔ معروف اور مجہول لیکن یونانی اور سنسکرت میں ان کے ساتھ ایک اور طور بھی ملتا ہے جسے میانہ کہتے ہیں۔ اردو میں بھی معروف، مجہول اور میانہ تینوں طور پائے جاتے ہیں۔

معروف: فعل کا وہ طور ہے جس سے فاعل خود کام کرتا ہے جیسے لڑکا گائے باندھتا ہے۔ اس طور کی دوسری مثالیں یہ ہیں۔ کھولنا، مارنا، سینا، دینا وغیرہ۔

مجہول: فعل کا وہ طور ہے جس سے فاعل کام کا اثر محسوس کرتا ہے جیسے لڑکے سے گائے باندھی جاتی ہے۔ کچھ دوسری مثالیں یہ ہیں کھولا جانا، مارا جانا، سیا جانا، دیا جانا وغیرہ۔

مجہول بنانے کا طریقہ: اردو میں فعل مجہول ہمیشہ فعل معروف سے بنایا جاتا ہے لیکن یہ اس فعل معروف سے بنتا ہے جس کے حالیہ تمام کے ساتھ "نے" بولا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ حالیہ تمام معروف پر "جانا" اور اس کے مختلف روپوں کا اضافہ کر کے اسی روپ کا مجہول بنا لیا جاتا ہے جیسے پیٹنا سے پیٹا جانا۔ پیٹتا سے پیٹا جاتا۔ پیٹ رہا سے پیٹا جا رہا۔ پیٹا سے پیٹا گیا۔ پیٹے سے پیٹا جائے۔ پیٹے گا سے پیٹا جائے گا۔

اسی طرح جمع مذکر، واحد مونث اور جمع مونث کے مجہول روپ بھی بنائے جا سکتے ہیں اور دوسرے افعال کے بھی مجہول روپ تیار کئے جا سکتے ہیں۔

میانہ: فعل کا وہ طور ہے جس سے فعل فاعل کی غرض اور شرکت سے انجام پاتا ہے یعنی فاعل اپنے ہی لئے کام کرتا ہے جیسے گائے بندھتی ہے۔

یہ طور فعل بھی اس فعل معروف سے بنتا ہے جس کے حالیہ تمام کے ساتھ "نے" بولا جاتا ہے۔ اس کے بنانے کے کئی طریقے ہیں:

۱۔ نرم سُر کو تیکھے سُر سے بدل کر جیسے:

معروف	میانہ	معروف	میانہ
دیکھنا	دکھنا (دی کھنا)	چاند دیکھا	چاند دکھا (دی کھا)
ڈبونا	ڈوبنا	قلم ڈبا	قلم ڈوبا
بُوڑنا	بُڑنا	قلم بوڑا	قلم بُڑا

معروف	میانہ	معروف	میانہ
سُوکھنا	سوکھنا	پانی سوکھا	پانی سوکھا
سوچنا	سُوجھنا، سوجھنا	تدبیر سوچی	تدبیر سوجھی

۲۔ روپ بدل کر یعنی صوتی تبادل سے میروپ بنا کر جیسے:

معروف	میانہ	معروف	میانہ
چھوڑنا	چھوٹنا، چھٹنا	بندوق چھوڑی	بندوق چھوٹی
توڑنا	ٹوٹنا	پیالہ توڑا	پیالہ ٹوٹا
پھوڑنا	پھوٹنا	آبلہ پھوڑا	آبلہ پھوٹا
پھاڑنا (پھٹانا)	پھٹنا	دامن پھاڑا	دامن پھٹا
بیچنا	بکنا	سودا بیچا	سودا بکا

۳۔ لام کے اضافے سے جیسے:

معروف	میانہ	معروف	میانہ
سینا	سِلنا	کوٹ سیا	کوٹ سلا
دینا	دِلنا	کواڑوں میں ہاتھ دیا	کواڑوں میں ہاتھ دلا
چھونا	چھُلنا	دھنیا چھوئی	دھنیا چھلی
دھونا	دُھلنا	قمیص دھوئی	قمیص دُھلی
ڈھونا	ڈھلنا	سامان ڈھویا	سامان ڈھلا

۴۔ سُر بدل کر جیسے:

معروف	میانہ	معروف	میانہ
لتھیڑنا	لتھڑنا	ہاتھ خون میں لتھیڑا	ہاتھ خون میں لتھڑا
نبیڑنا	نبڑنا	کام نبیڑا	کام نبڑا
سمیٹنا	سمٹنا	فرش سمیٹا	فرش سمٹا
بکھیرنا	بکھرنا	بال بکھیرے	بال بکھرے
ڈھکیلنا	ڈھکلنا	ٹھیلا ڈھکیلا	ٹھیلا ڈھکلا

۵۔ سُر مختصر کر کے جیسے:

معروف	میانہ	معروف	میانہ
لیسنا	لِسنا	دیوار لیسی	دیوار لِسی
بھیڑنا	بھڑنا	کواڑ بھیڑا	کواڑ بھڑا
گھیرنا	گھرنا	شکار گھیرا	شکار گھرا

معروف	میانہ	معروف	میانہ
پھیرنا	پھرنا	حصہ پھیرا	حصہ پھرا
پیلنا	پلنا	سرسوں پیلی	سرسوں پلی
گھولنا	گھلنا	شربت گھولا	شربت گھلا
جوڑنا	جڑنا	ورق جوڑا	ورق جڑا
مارنا	مرنا	نوجوان مارا	نوجوان مرا
پیٹنا	پٹنا	چور پیٹا	چور پٹا
پیسنا	پسنا	آٹا پیسا	آٹا پسا

۹۔ مجہول کا لاحقہ دور کر کے جانا کے اضافے سے جیسے:

کسنا	کس جانا	چارپائی کسی	چارپائی کس گئی
جڑنا	جڑ جانا	شیشہ جڑا	شیشہ جڑ گیا
چلنا	چل جانا	چال چلی	چال چل گئی
بھرنا	بھر جانا	دامن بھرا	دامن بھر گیا
دھرنا	دھر جانا	گٹھڑی دھری	گٹھڑی دھر گئی
گھسنا	گھس جانا	جوتے گھسے	جوتے گھس گئے
الٹنا	الٹ جانا	ورق الٹا گیا	ورق الٹ گیا
لکھنا	لکھ جانا	کتاب لکھی	کتاب لکھ گئی
بیاہنا	بیاہ جانا	لڑکی بیاہی	لڑکی بیاہ گئی

۱۰۔ مختلف افعال سے جیسے:

پانا	ملنا	انعام پایا	انعام ملا
رکھنا	رہنا	نوکر رکھا	نوکر رہا
کرنا	ہونا	کام کیا	کام ہوا
ڈالنا	ڈلنا یا پڑنا	داغ ڈالا	داغ ڈلا یا پڑا

ذیل میں معروف، مجہول اور میانہ تینوں صورتوں کی کچھ مثالیں ساتھ ساتھ دی جاتی ہیں:

معروف	مجہول	میانہ
کھینچنا	کھینچا جانا	کھنچنا
چیرنا	چیرا جانا	چرنا
چھیڑنا	چھیڑا جانا	چھڑنا
جھونکنا	جھونکا جانا	جھکنا
ٹھونکنا	ٹھونکا جانا	ٹھکنا
گھونٹنا	گھونٹا جانا	گھٹنا
لادنا	لادا جانا	لدنا
موڑنا	موڑا جانا	مڑنا
مانگنا	مانگا جانا	منگنا
گھوٹنا	گھوٹا جانا	گھٹنا
روپنا	روپا جانا	رپنا
جھاڑنا	جھاڑا جانا	جھڑنا
ٹیکنا	ٹیکا جانا	ٹکنا
ٹانگنا	ٹانگا جانا	ٹنگنا
چاپنا	چاپا جانا	چپنا
چھاپنا	چھاپا جانا	چھپنا
چھانٹنا	چھانٹا جانا	چھٹنا
باندھنا	باندھا جانا	بندھنا
دابنا	دابا جانا	دبنا
تولنا	تولا جانا	تلنا
چھیکنا	چھیکا جانا	چھکنا
پھینکنا	پھینکا جانا	پھکنا
کیلنا	کیلا جانا	کلنا
گاڑنا	گاڑا جانا	گڑنا

معروف	مجہول	میانہ
سمیٹنا	سمیٹا جانا	سمٹنا
چوسنا	چوسا جانا	چسنا
ٹالنا	ٹالا جانا	ٹلنا
موڑنا	موڑا جانا	مڑنا
لوٹنا	لوٹا جانا	لٹنا
کاٹنا	کاٹا جانا	کٹنا
پچھاڑنا	پچھاڑا جانا	پچھڑنا
گوندھنا	گوندھا جانا	گندھنا
پھانسنا	پھانسا جانا	پھنسنا
گانٹھنا	گانٹھا جانا	گٹھنا
پونچھنا	پونچھا جانا	پنچھنا

اردو کے روزمرے میں مجہول بہت کم بولتے ہیں۔ اس کی جگہ بالعموم میانہ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جہاں میانہ نہیں ملتا وہاں فعل کو غیر شخصی طور پر بول جاتے ہیں جیسے:

اصل	بدل
کہا جاتا ہے۔	کہتے ہیں۔
مریض کو اسپتال لے جایا گیا۔	مریض کو اسپتال لے گئے۔
اس کا تعارف کرایا جاتا ہے۔	اس کا تعارف کراتے ہیں۔

اردو کے گرامر نویس عام طور میانہ کو غلطی سے فعل لازم شمار کر لیتے ہیں۔

گردان:

اردو میں گردان دو طرح سے ہوتی ہے۔ ۱۔ صیغوں کے لاحقوں سے اور ۲۔ حالیوں سے۔

۱۔ صیغے۔ صیغے چار ہیں۔ میں ہم تو تم۔ اس لحاظ سے فعل "چل" کی گردان یوں ہوتی ہے۔

میں چلوں ہم چلیں تو چلے تم چلو۔

اس طرح صیغوں کے چار لاحقے ہوتے ہیں۔ اوں، ایں، اے، او جنھیں تنہا بولیں۔

بنیں۔ بجے اور ہو بولتے ہیں۔

۲۔ حالیے بھی چار ہیں۔ ناتمام [چلتا]۔ تمام [چلا]۔ جاری [چل رہا]۔ آغاز [چلنا]۔ ان میں سے اول دو حالیے افعال کی گردان کے لئے تنہا استعمال ہوتے ہیں۔ عدد اور جنس کے لحاظ سے ان کی چار شکلیں ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کی گردان یوں ہوتی ہے۔

حالیہ ناتمام: میں چلتا۔ میں چلتی۔ ہم چلتے۔ تو چلتا۔ تو چلتی۔ تم چلتے۔ تم چلتیں۔

حالیہ تمام: میں چلا۔ میں چلی۔ ہم چلے۔ تو چلا۔ تو چلی۔ تم چلے۔ تم چلیں۔

حالیہ جاری (چل رہا) اور حالیہ آغاز [چلنا جیسے: دس بجے گاڑی چلنی ہے] دونوں تنہا نہیں آتے بلکہ ان کے ساتھ صیغوں اور حالیوں کے لاحقے بولے جاتے ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

فعل لاحقے

زمانہ مستقبل کے لئے صیغوں پر گا۔ گی۔ گے کے لاحقے بڑھا دیتے ہیں جیسے:

میں چلوں گا۔ میں چلوں گی۔ ہم چلیں گے۔ تو چلے گا۔ تو چلے گی۔ تم چلو گے۔ تم چلو گی۔

زمانہ حال کے لئے صیغوں کے چاروں لاحقے تنہا بھی بولے جاتے ہیں جیسے:

۱۔ میں ہوں۔ ہم ہیں۔ تو ہے۔ تم ہو۔

۲۔ اسم کے ساتھ صرف دو لاحقے ہے (واحد) اور ہیں (جمع) بولے جاتے ہیں جیسے:

لڑکا ہے۔ لڑکے ہیں۔

اس کے علاوہ حالیوں کے ساتھ بھی بولے جاتے ہیں جیسے:

حالیہ ناتمام: میں چلتا ہوں، میں چلتی ہوں، ہم چلتے ہیں٭، تو چلتا ہے، تو چلتی ہے، تم چلتے ہو، تم چلتی ہو۔

حالیہ تمام: میں چلا ہوں، میں چلی ہوں، ہم چلے ہیں٭، تو چلا ہے، تو چلی ہے، تم چلے ہو، تم چلی ہو۔

حالیہ جاری: میں چل رہا ہوں، میں چل رہی ہوں، ہم چل رہے ہیں٭، تو چل رہا ہے، تو چل رہی ہے، تم چل رہے ہو، تم چل رہی ہو۔

حالیہ آغاز ۱۔ (اسما کے ساتھ)۔ گاڑی چلنی ہے۔ گاڑیاں چلنی ہیں۔ جھگڑا چلنا ہے۔

٭ جمع متکلم کا یہ روپ مذکر اور مونث دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

جھگڑے چلتے ہیں۔

۲۔ ضمیروں کے ساتھ حالیہ آغاز کے معنوں میں چلنے والا، چلنے والی، چلنے والے الفاظ بولے جاتے ہیں جیسے:

میں چلنے والا ہوں، میں چلنے والی ہوں، ہم چلنے والے ہیں٭، تو چلنے والا ہے، تو چلنے والی ہے، تم چلنے والے ہو، تم چلنے والی ہو۔

زمانہ ماضی کے لئے حالیوں پر تھا، تھی، تھے، تھیں کے لاحقے بڑھا دیے جاتے ہیں جیسے:

حالیہ ناتمام: میں چلتا تھا، میں چلتی تھی، ہم چلتے تھے٭، تو چلتا تھا، تو چلتی تھی، تم چلتے تھے، تم چلتی تھیں۔

حالیہ تمام: میں چلا تھا، میں چلی تھی، ہم چلے تھے٭، تو چلا تھا، تو چلی تھی، تم چلے تھے، تم چلی تھیں۔

حالیہ جاری: میں چل رہا تھا، میں چل رہی تھی، ہم چل رہے تھے٭، تو چل رہا تھا، تو چل رہی تھی، تم چل رہے تھے، تم چل رہی تھیں۔

حالیہ آغاز: (۱) اسما کے ساتھ (لڑکا چلنا تھا، لڑکی چلنی تھی، لڑکے چلنے تھے، لڑکیاں چلنی تھیں۔)

۲۔ ضمیروں کے ساتھ حالیہ آغاز کے معنوں میں چلنے والا، چلنے والی، چلنے والے کے الفاظ بولے جاتے ہیں جیسے:

میں چلنے والا تھا، میں چلنے والی تھی، ہم چلنے والے تھے٭، تو چلنے والا تھا، تو چلنے والی تھی، تم چلنے والے تھے، تم چلنے والی تھیں۔

زمانے:

یوں تو زمانے کی تین ہی قسمیں ہوتی ہیں۔ ماضی، حال، مستقبل لیکن اردو میں مختلف زمانوں اور طریقوں کے لحاظ سے مندرجہ ذیل جملے بولے جاتے ہیں۔

ساخت	زمانہ	مثال
۱۔ فعل + صیغے کا لاحقہ	حال شرطی اور مستقبل شرطی (مضارع)	میں چلوں
۲۔ فعل + صیغے کا لاحقہ + لاحقہ مستقبل	مستقبل بیانیہ	میں چلوں گا
۳۔ حالیہ ناتمام	ماضی شرطی	میں چلتا
حالیہ تمام	-	میں چلا تو اپنے ساتھ لشکر لے کر چلا

٭ جمع متکلم کا یہ روپ مذکر اور مونث دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

ساخت	زمانہ	مثال
۴۔ حالیہ تمام	مستقبل شرطی	میں چلا تو تمھیں بھی ساتھ لے لوں گا
فعل + صیغے کا لاحقہ + لاحقہ مستقبل	-	میں چلوں گا تو تمھیں بھی ساتھ لے لوں گا
۵۔ حالیہ تمام	ماضی مطلق بیانیہ	میں چلا
۶۔ حالیہ ناتمام + لاحقہ صیغہ	حال عادی	میں چلتا ہوں
۷۔ حالیہ ناتمام + لاحقہ حالیہ	ماضی عادی	میں چلتا تھا
۸۔ حالیہ تمام + لاحقہ صیغہ	ماضی قریب	میں چلا ہوں
۹۔ حالیہ تمام + لاحقہ حالیہ	ماضی بعید	میں چلا تھا
۱۰۔ حالیہ آغاز + لاحقہ حالیہ	ماضی وجوبی	گاڑی چلنا تھی / میں چلنے والا تھا
۱۱۔ حالیہ آغاز + لاحقہ صیغہ	حال وجوبی	گاڑی چلنی ہے / میں چلنے والا ہوں
۱۲۔ حالیہ جاری + لاحقہ حالیہ	ماضی جاری	میں چل رہا تھا
۱۳۔ حالیہ جاری + لاحقہ صیغہ	حال جاری	میں چل رہا ہوں

نحو:

جملہ عموماً لفظوں کے مجموعے کو کہتے ہیں لیکن سب سے چھوٹا جملہ ایک لفظ کا بھی ہوتا ہے جیسے امر کہتے ہیں۔ اس میں واحد مخاطب کا صیغہ مضمر ہوتا ہے۔ جیسے چل یعنی تو چل۔ بیٹھ یعنی تو بیٹھ۔ دیکھ یعنی تو دیکھ۔

جملے کا انداز

اغراض زبان کے لحاظ سے جملے تین قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ امری۔ اس میں مخاطب سے کسی کام کے کرنے کے لئے کہا جاتا ہے جیسے: کام کر، گھر جا وغیرہ۔

۲۔ بیانی۔ اس میں صرف کوئی اطلاع دی جاتی ہے جیسے، لڑکا کتاب پڑھتا ہے۔

۳۔ استفہامی۔ اس میں کسی معلومات کا حصول مدنظر ہوتا ہے جیسے: تم کہاں گئے تھے؟ کیا مکان کے باہر پانی بہہ رہا ہے؟

جملے کی اقسام

فاعل کے لحاظ سے جملے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ فاعلی اور غیر فاعلی۔

۱۔ فاعلی وہ جملہ ہے جس میں فاعل موجود ہوتا ہے جیسے لڑکا چلا۔ لڑکا چلے گا۔ لڑکا اچھی چال چلتا ہے۔ ان تمام جملوں میں لڑکا فاعل ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ فعل عدد اور جنس میں لڑکے سے مطابقت رکھتا ہے۔

۲۔ غیر فاعلی۔ وہ جملہ ہے جس میں فاعل موجود نہیں ہوتا۔ جیسے، لڑکی نے بلی کو مارا۔ بلی کو مارا گیا۔ ان جملوں میں فاعل موجود نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے فعل مارا اور مارا گیا۔ عدد اور جنس میں لڑکی اور بلی میں سے کسی سے بھی مطابقت نہیں رکھتے۔

بناوٹ کے لحاظ سے بھی جملہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ مفرد اور مرکب۔

۱۔ مفرد۔ وہ جملہ ہے جس میں ایک مکمل فعل ہوتا ہے جیسے میں جاتا ہوں۔ خالد کھانا کھائے گا۔

۲۔ مرکب۔ وہ جملہ ہے جو کئی مفرد جملوں کے ملنے سے بنتا ہے۔ ان مفرد جملوں کو عطفیوں سے جوڑا جاتا ہے۔ جیسے، بزرگوں نے کہا ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ ایک آیا اور دوسرا گیا۔

ان مرکب جملوں میں "کہ" "اور" "اور" عطفئے ہیں جو دو دو مفرد جملوں کو ملا رہے ہیں۔

ترتیب

دنیا کی مختلف زبانوں میں اجزائے جملہ کی مندرجہ ذیل ترتیبیں ہوتی ہیں[1]۔

فاعل فعل مفعول	۔	انگریزی، فرانسیسی، چینی
فاعل مفعول فعل	۔	جاپانی، فارسی
فعل فاعل مفعول	۔	عربی، ہسپانوی
فعل مفعول فاعل	۔	میلاگاسی، ہسپانوی، عربی
مفعول فعل فاعل	۔	ہکس کاریا
مفعول فاعل فعل	۔	اپورنا

۱۔ موڈرن لنگوئسٹکس ص ۱۰۲ اور ۲ ایکسس آف لنگویج ص ۱۹۱۔

اردو میں عموماً پہلے فاعل، اس کے بعد دوسرے اجزا اور سب سے آخر میں فعل آتا ہے جیسے سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ اس جملے میں فعل "نکلتا ہے" سب سے آخر میں ہے اور سورج جو اس کا فاعل ہے سب سے پہلے آیا ہے لیکن کبھی کبھی یہ ترتیب بدل جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جس لفظ پر زور دینا چاہتے ہیں اسے پہلے لے آتے ہیں۔ چنانچہ الفاظ و اجزا کی اس تقدیم و تاخیر سے متکلم کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔ مثلاً

آپ سب سے پہلے میرے پاس آئیے۔	یہ جملے کی صحیح اور ابتدائی ترتیب ہے۔
سب سے پہلے آپ میرے پاس آئیے۔	یعنی اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا شخص میرے پاس آئے۔
میرے پاس آپ سب سے پہلے آئیے۔	یعنی دوسرے کے پاس بعد میں جائیے گا۔

صفت بالعموم موصوف سے پہلے آتی ہے جیسے کالی بلی۔ لال گھوڑی لیکن جب صفت جملے میں مسند کے جزو کی طرح بولی جاتی ہے تو موصوف کے بعد آتی ہے جیسے بلی کالی ہے۔ گھوڑی لال ہے۔

انگریزی یا فارسی میں عامل اسم سے پہلے اور اردو میں اسم کے فوراً بعد آتا ہے جیسے میرے صندوق میں۔ بازار تک وغیرہ اور عامل اور معمول (اسم) کے بیچ میں کوئی لفظ لانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

مرکب جملوں میں شرط کا جملہ پہلے اور جزا کا بعد میں آتا ہے جیسے اگر تم نہ آتے تو میں تم سے ناراض ہو جاتا۔ علت پہلے اور معلول بعد میں جیسے مجھے نیند آ رہی تھی اس لئے میں جلدی سے گھر چلا گیا۔ صلہ پہلے اور موصول بعد میں۔ جیسے جو جاگے گا سو پائے گا۔ جو سوئے گا سو کھوئے گا۔

مطابقت

فرانسیسی اور جرمن کی طرح اردو میں بھی صفت بجز جمع مونث کے باقی عدد اور جنس میں اپنے موصوف کے مطابق رہتی ہے جیسے کالا کتا۔ کالی بلی۔ کالی بلیاں۔ کالے کتے۔

بہت سی مشرقی اور مغربی زبانوں کی طرح اردو میں بھی فعل اپنے عدد اور جنس میں فاعل کے مطابق رہتا ہے جیسے لڑکا چلتا ہے۔ لڑکا ناشپاتی کھاتا ہے۔ لڑکا کتاب پڑھے گا۔ ان سب جملوں میں فاعل عدد اور جنس میں اپنے فاعل لڑکے سے مطابقت رکھتا ہے۔

اب یہ جملے پڑھئے۔ لڑکے نے ناشپاتی کھائی۔ لڑکی نے آم کھایا۔ ان جملوں میں فعل کھائی عدد اور جنس میں ناشپاتی اور فعل کھایا عدد اور جنس میں آم سے مطابقت رکھتا ہے اس لئے پہلے جملے میں ناشپاتی اور دوسرے جملے میں آم فاعل لیکن اردو گرامر کی کتابوں کے مطابق ان جملوں میں بھی لڑکا

اور لڑکی ہی فاعل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان جملوں کے معنی کے لحاظ سے انھیں کو کام کرنے والا سمجھتے ہیں لیکن یہ معنوی فاعل ہیں جبکہ ناسپاتی اور آم گرامری فاعل ہیں[1]

معنوی اور گرامری فاعل کی یہ تفریق اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ گرامر کی مروجہ کتابوں میں فاعل سے کام کا کرنے والا مراد لیا گیا ہے[2] یہ لفظ (فاعل) عربی کا ہے اور عربی گرامر کی بنیاد معنی پر استوار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات فاعل کو کام کرنے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ذرا مندرجہ ذیل جملوں پر غور کیجئے۔ ہم ان جملوں میں فاعل کو معنوی طور پر کام کا کرنے والا نہیں کہہ سکتے۔

۱۔ بچہ بیمار ہے۔

۲۔ گاڑی سے نکل کر ایک آدمی مر گیا۔

۳۔ ساری محنت ضائع چلی گئی۔

۴۔ چلتے چلتے کام بگڑ گیا۔

۵۔ جان طوفان کی لہروں میں ڈوب گیا[3]

پھر اس جملے میں کہ "لڑکے سے ناسپاتی کھائی گئی" گرامر کی یہ کتابیں ناسپاتی کو فعل مجہول "کھائی گئی" کا فاعل قرار دیتی ہیں لیکن "لڑکے نے ناسپاتی کھائی" میں ناسپاتی کو فعل معروف "کھائی" کا فاعل نہیں مانتیں اور یہ عجیب تضاد ہے کیونکہ دونوں جملوں میں کھانے والا لڑکا ہے اور کھائی جانے والی چیز ناسپاتی ہے اس لئے ایک جگہ لڑکے کو اور دوسری جگہ ناسپاتی کو فاعل قرار دینا منطقی طور پر درست نہیں۔

ختم شد

۱۔ ابو محمد سحر، لنگوئسٹکس ص ۸۷۔

۲۔ ملاوی، لنگوئسٹکس ص ۱۹۔

۳۔ ہاں، گرامر ص ۸۔

صاحب طرز نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے۔

کتابیات

1. John Lyons, *New Horizons in Linguistics*, Penguin Books Ltd, England 1980.
2. Geoffrey Leech, *Semantics*, Penguin Books Ltd, England 1978.
3. F. R. Palmer, *Semantics*, Cambridge University Press, Cambridge 1979.
4. Neil Smith & Deirdre Wilson, *Modern Linguistics*, Penguin Books Ltd, England 1979.
5. David E. Cooper, *Philosophy and The Nature of Language*, Longmans group Ltd, London 1973.
6. John Lyons, *Language and Linguistics*, Cambridge University Press, Cambridge 1981.
7. Edgar H. Sturtevant, *Introduction to Linguistic Science*, Yale University Press, U.S.A. 1956.
8. P. H. Mathews, *Morphology*, Cambridge University Press, Cambridge 1974.
9. Otto Jesperson, *Language; Its Nature, Development and Origin*, Unwin Brothers Ltd, London 1964.
10. Frank Palmer, *Grammar*, Hazell Watson and Viney Ltd, Aylesburg, Bucks 1979.
11. Edward Sapir, *Language*, Harcourt, Brace & Co., New York 1921.
12. Stephen Ullmann, *The Principles of Semantics*, Basil Blackwell, Oxford 1967.
13. Leonard Bloomfield, *Language*, Holt, Rinehart and Winston, New York 1966.
14. Charles F. Hockett, *A Course in Modern Linguistics*, The Macmillan Company, New York 1967.
15. James M. Anderson, *Structural Aspects of Language Change*, Low & Brydone Ltd., Thetford, New York 1973.
16. Noam Chomsky, *Language and Responsibility*, Pantheon Books, New York 1979.
17. William J. Entwistle, *Aspects of Language*, Faber & Faber, 24 Russell Square, London 1953.
18. Stephen Ullmann, *Language and Style*, Basil Blackwell, Oxford, 1966.
19. Robins, R. H., *General Linguistics*, Longmans Group Ltd, London 1971.

نام: سید محمود نقوی

قلمی نام: سہیل بخاری

سلسلہ نسب: دسویں پیڑھی میں سید محمد ہاشم (اتالیق اورنگ زیب عالمگیر، شہزادہ معظم) اور ۱۱ ویں پیڑھی میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور تیرہویں میں امام علی نقی علیہ السلام سے ملتا ہے۔

پیدائش: ۲۰ دسمبر ۱۹۱۲ء بمقام موضع سرائے شیخ، ضلع مین پوری یوپی، بھارت۔

وفات: ۲۹ جنوری ۱۹۹۰ء بمقام کراچی، پاکستان۔

تحصیل علم

ابتدائی تعلیم۔ راجپوتانہ، بھارت

ایس ٹی سی۔ گورنمنٹ ٹریننگ کالج آگرہ ۱۹۳۸ء

بی اے۔ آگرہ یونیورسٹی ۱۹۴۰ء

ایم اے (اردو)۔ ناگپور یونیورسٹی ۱۹۵۰ء

پی ایچ ڈی (اردو)۔ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۳ء

ملازمت:

۱۹۳۹ء تا ۱۹۵۲ء۔ محکمہ تعلیم یوپی، بھارت۔

۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۵ء۔ پرنسپل پی اے ایف اسٹیشن اسکول، ۱۹۵۵ء۔

۱۹۵۵ء تا ۱۹۷۳ء۔ صدر شعبہ اردو پی اے ایف کالج سرگودھا۔

۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۸ء۔ شریک مدیر، اردو لغت بورڈ کراچی۔

20. Jones, Daniel, *The Phoneme*, W. Heffar and Sons Ltd., Cambridge, England 1967.

21. Dr. Panderang Damodar Gune, *An Introduction to Comparative Philology*, Puna Oriental Book House, Poona 1962.

22. H. C. Scholberg, *Concise Grammar of the Hindi Language*, Oxford University Press, London 1962.

23. J. R. Firth, *The Tongues of Men and Speech*, Oxford University Press, London 1962.

24. J. Vendryes, *Language*, Translated by Paul Radin, Routledge & Kegan Paul Ltd., London 1952.

25. F. C. Stork and J. D. A. Widdowson, *Learning about Linguistics*, Hutchinson Educational Ltd., 3 Fitzroy Square, London W1 1974.

26. Robert Lord, *Comparative Linguistics*, The English University Press Ltd., 1974.

27. Ogden, C. K. and Richards, I. A., *The Meaning of Meaning*, London 1946.

28. A. A. Macdonell, *Vedic Primer*, Oxford University Press, London.

29. J. R. Firth, *Papers in Linguistics*, Oxford University Press, London 1957.

اردو کی کتابیں

۱۔ سب رس پر ایک نظر۔ سہیل بخاری۔ آزاد بک ڈپو لاہور / سرگودھا ۱۹۶۰ء۔

۲۔ باغ و بہار پر ایک نظر۔ سہیل بخاری۔ آزاد بک ڈپو لاہور / سرگودھا ۱۹۶۸ء۔

۳۔ اردو کا روپ۔ سہیل بخاری۔ آزاد بک ڈپو لاہور / سرگودھا ۱۹۷۱ء۔

۴۔ اردو کی کہانی۔ سہیل بخاری۔ مکتبہ عالیہ لاہور / ندرت پرنٹرز لاہور ۱۹۷۵ء۔

۵۔ خطوط غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔ علمی پرنٹنگ پریس لاہور۔ بار دوم

۶۔ فرہنگ آصفیہ جلد اول۔ مولفہ منشی سید احمد دہلوی

۷۔ رسالہ گلکرسٹ

۸۔ افضل القواعد۔ مولوی فتح محمد خاں جالندھری

۹۔ مصباح القواعد۔ مولوی فتح محمد خاں جالندھری

۱۰۔ قواعد اردو۔ مولوی عبدالحق

۱۱۔ قواعد اردو۔ شوکت سبزواری۔ حق آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی ۱۹۷۲ء۔